الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

جو قوم اپنے غلط کاروں کو نہ روکے
وہ کبھی ان کی غلط کاری کے انجام سے
محفوظ نہیں رہ سکتی

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

جون ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۷

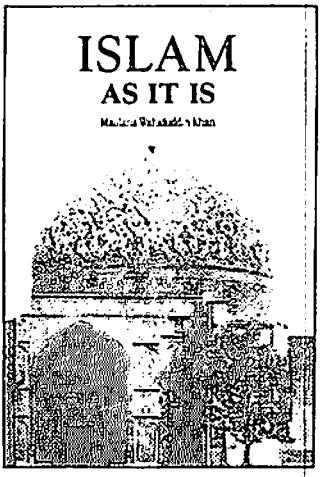

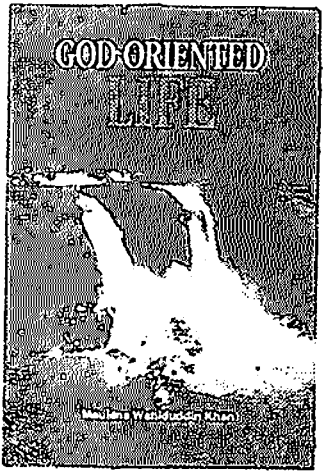

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۷

جنت کی نعمتیں	۴	رسول کی خلاف ورزی	۱۴
تکبیر، تواضع	۵	مطلوب عمل	۱۵
علم کی اہمیت	۶	شک سے بچئے	۱۶
روایت کو توڑنا	۷	تنقید، نزاع	۱۷
جاننے کی تڑپ	۸	مذہب کی طرف	۱۸
خوش خبری	۹	اسلامی حل	۲۴
مواقع کھونا	۱۰	وسط ایشیا	۲۶
حسرت کا دن	۱۱	فطرت کی آواز	۲۹
کلام کی دو قسمیں	۱۲	سفر امریکہ — ۶	۳۰
حق کی پہچان	۱۳	الرسالہ بک سنٹر	۵۰

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

جنّت کی نعمتیں

اُکیدر بن عبدالملک الکندی (م ۱۲ھ) دومۃ الجندل کا عیسائی حاکم تھا۔ غزوہ تبوک (۹ ھ) میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے مقام کے قریب پہونچے تو وہ آکر آپ سے ملا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد وہ پھر گیا۔ خلیفہ اول کے زمانہ میں حضرت خالد بن الولید رضؓ نے اس سے جنگ کی جس میں وہ مارا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ اُکیدر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آیا تو اس کے جسم پر نہایت شاندار لباس تھا۔ حضرت انس بن مالک رضؓ کہتے ہیں :

رأیت قباء اکیدر حین قدم به علی رسول الله صلی الله علیه وسلم فجعل المسلمون یلمسونه بایدیهم ویتعجبون منه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : اتعجبون من هذا، فوالذی نفسی بیده لمناديل سعد بن معاذ فی الجنة احسن من هذا۔

(البدایۃ والنہایۃ ۵/ ۱۷)

میں نے اکیدر کی قبا اس وقت دیکھی ہے جب کہ وہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ مسلمان اس کی قبا کو اپنے ہاتھ سے چھونے لگے اور اس پر تعجب کرنے لگے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم لوگ اس پر تعجب کر رہے ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بلاشبہ جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔

جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت ابدی ہے اسی طرح آپ کا یہ کلام بھی ابدی ہے۔ آپ کا یہ قول صرف پہلی صدی ہجری کے ایک خوش پوش انسان کے بارے میں نہیں ہے بلکہ قیامت تک کی ان تمام دنیوی چیزوں کے بارہ میں ہے جن کی ظاہری رونق پر لوگ تعجب کریں اور جن کو دیکھنے والے رشک کی نظروں سے انھیں دیکھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی جو چیزیں لوگوں کو آج بہت خوش نما نظر آتی ہیں، جنت کی چیزیں ان کے مقابلہ میں بے حساب گنا زیادہ خوش نما اور پُر راحت ہوں گی۔ اس وقت آدمی کو محسوس ہوگا کہ جو کچھ اس نے کھویا وہ کچھ بھی نہ تھا، جب کہ اس نے جو کچھ پایا ہے وہ سب کچھ سے بھی بہت زیادہ ہے۔

تکبیر، تواضع

اللہ کے مقابلہ میں کَبِّرہ کا حکم ہے اور انسان کے مقابلہ میں تواضعوا کا۔ یعنی اللہ کے مقابلہ میں یہ مطلوب ہے کہ اس کو اپنا کبیر بنایا جائے۔ اور انسان کے مقابلہ میں یہ مطلوب ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تواضع کا رویہ اختیار کریں۔ یہی تکبیر اور تواضع دو لفظ میں پورے دین کا خلاصہ ہے۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم اللہ ہی کی خوب بڑائی بیان کرو (وکبّرہ تکبیرا، الاسراء ۱۱۱) دوسری جگہ فرمایا کہ تم صرف اپنے رب کی بڑائی کرو (وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، المدثر ۳)

اللہ کی معرفت کے بعد آدمی کے دل میں اپنے خالق و مالک کے لیے جو سب سے بڑا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ اس کو ساری عظمت صرف ایک اللہ کی طرف دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اللہ کو کبیر کی حیثیت سے دریافت کرنا اس کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ اور دوسرے تمام انسان اللہ کے مقابلہ میں صرف صغیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ احساس ہے جو ایک مومن کی زندگی میں عبادت، تقوی، خشوع، تضرع اور انابت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عیاض بن حِمار کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اللہ نے میری طرف یہ وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے (انّ اللہ اوحَی الیَّ ان تواضعوا حتیٰ لا یفخرَ اَحَدٌ علی اَحَدٍ ولا یبْغِیَ اَحَدٌ علیٰ اَحَدٍ) ریاض الصالحین ۱۸۱

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلہ میں کیسا ہونا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ وہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں متواضع بن جائے۔ زیادہ والا کم والے پر فخر نہ کرے۔ طاقتور آدمی کمزور آدمیوں کے اوپر زیادتی نہ کرے۔

ایمان آدمی کے اندر جو شعور اور جو کیفیت پیدا کرتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو اپنا کبیر بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو صغیر بنا لیتا ہے۔ پھر یہی شعور اس کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو قابلِ احترام سمجھے، وہ ان کے ساتھ تواضع کا رویہ اختیار کرے نہ کہ سرکشی اور تحقیر کا۔

علم کی اہمیت

ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ محمدؐ کو اس اعتبار سے شہرت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے پیروؤں کو علم حاصل کرنے کی تاکید کی۔ خواہ اس کے لیے انھیں چین جانا پڑے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ انھوں نے کچھ جنگی قیدیوں کو یہ اجازت دی کہ وہ قید سے اس طرح رہائی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص تعداد میں مسلمانوں کو پڑھنا اور لکھنا سکھا دیں۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ ہی میں ایسے مکاتب قائم ہو گیے تھے جہاں لوگوں کو تعلیم دی جائے اور انھیں خواندہ بنایا جا سکے۔

مسلمانوں میں تعلیم مختلف طریقوں سے پھیلی۔ مثلاً قرآن، حدیث اور فقہ کو سیکھنے کے ذریعہ۔ عربی زبان چونکہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے ضروری تھی، اس لیے عربی بھی ان کی تعلیم کا جز بنی رہی۔ اسی کے ساتھ منطق اور کلام بھی۔ فقہ کا علم گاؤں تک کے لوگوں کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے معاشرہ کی ہر سطح پر علم پھیل گیا۔

ہر مسجد مسجد ہونے کے ساتھ مدرسہ کا بھی کام کرنے لگی۔ لوگ مسجد کے صحن میں جمع ہو کر حدیث اور فقہ پر مباحثہ کرنے لگے۔ جب بھی کوئی شخص مستند عالم کی حیثیت اختیار کر لیتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس کا گھر ایک مدرسہ بن جاتا۔ لوگ ایک مسجد سے دوسری مسجد کا سفر کرنے لگے تاکہ مستند علماء سے علم حاصل کر سکیں۔ بہت سی مسجدوں میں کتب خانے بن گیے۔ یہ کتب خانے عوام کے لیے حصول علم کا مستقل ذریعہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کتب خانہ اسلامی معاشرہ کا ایک اہم جز رہا۔ بہت سے ادارے ایسے قائم تھے جہاں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ وہ لٹریچر جس نے یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے لیے محرک کا کام کیا، اس کا بیشتر حصہ انھیں مسلم کتب خانوں کے عربی ترجموں سے حاصل کیا گیا تھا۔

مذکورہ مستشرق اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ مذہب اسلام نے علم اور تعلیم کے حصول کے لیے ایک مستقل دباؤ پیدا کیا۔ رسمی مدرسوں (اور بغداد کی نظامیہ اور قاہرہ کے الازہر جیسی یونیورسیٹیوں) کے علاوہ اسلام میں دوسرے بہت سے طریقے ظہور میں آئے جو لوگوں کے لیے علم کے حصول کا ذریعہ تھے:

The New Encyclopaedia Britannica, Chicago 1984, Vol. 15, pp. 645-46.

علم کے بغیر آدمی نہ دنیا کو سمجھ سکتا اور نہ دین کی گہری معرفت حاصل کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے علم کو نمبر ایک اہمیت دی ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ ہر ممکن ذریعہ کو اختیار کر کے علم حاصل کیا جائے۔

روایت کو توڑنا

قرآن میں قتل کی برائی کو بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جس شخص نے کسی آدمی کو بلا سبب قتل کیا تو اس نے گویا سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اور جس شخص نے ایک آدمی کی زندگی کو بچایا تو اس نے گویا تمام آدمیوں کو بچا لیا (المائدہ ۳۲) اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص جب اس قسم کا جرم کرتا ہے تو وہ احترام جان کی روایت کو توڑتا ہے۔ احترام جان کی روایت ایک قسم کی نفسیاتی رکاوٹ ہے جو لوگوں کو اس سے روکے رہتی ہے کہ وہ کسی کی زندگی پر حملہ کریں۔ مگر جب کسی سماج میں یہ روایت ایک بار توڑ دی جائے تو پھر نفسیاتی رکاوٹ کی دیوار گر جاتی ہے۔ ایک شخص کے بعد دوسرے لوگ اس مجرمانہ عمل پر جری ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک آدمی کا قتل سارے آدمیوں کے قتل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے مسلم اسپین کی مثال لیجئے۔ اسپین کے مسلم عہد کے آخر میں مسلمان اپنی نااتفاقی کی بنا پر کمزور ہو گئے۔ اولاً وہ متفرق ریاستوں میں بٹ گئے۔ اور پھر ایک ایک کر کے یہ ریاستیں ختم ہو گئیں۔ آخر میں انھوں نے سلطنتِ غرناطہ قائم کی جس کا پہلا سلطان نصر بن یوسف تھا جو ابن الاحمر کے نام سے مشہور ہے۔ اسی بادشاہ نے غرناطہ میں مشہور محل الحمراء تعمیر کرایا۔

سلطنت غرناطہ کا تیسرا بادشاہ محمد مخلوع تھا۔ اس کو اس کے بھائی نصر بن محمد نے ۷۱۰ھ میں قتل کرا دیا تاکہ اس کا کوئی سیاسی رقیب باقی نہ رہے۔ اس قتل نے شاہی محل کے اندر احترام جان کی روایت کو توڑ دیا اور پھر بادشاہوں کے قتل کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ اس کے بعد سلطان ابوالولید کو اس کے بھتیجے نے ۷۲۵ھ میں قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد سلطان محمد تخت پر بیٹھا۔ اس کو اس کے رشتہ داروں نے ۷۳۳ھ میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد سلطان یوسف سلطنتِ غرناطہ کا حکمراں ہوا۔ مگر وہ بھی ۷۵۵ھ میں نیزہ مار کر ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان اسماعیل تخت نشین ہوا۔ مگر ۷۶۱ھ میں خود اس کے بھائی نے اس کو قتل کر دیا۔

غرض اس طرح ایک کے بعد ایک بادشاہوں کا قتل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۸۹۷ھ (۱۴۹۲) میں خود سلطنت غرناطہ کا خاتمہ ہو گیا۔ روایت کا تحفظ انسانیت کا تحفظ ہے۔ اور روایت کو توڑنا انسانیت کو توڑنا۔

جاننے کی تڑپ

ایک حدیث ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : انما شفاء العی السوال۔ یعنی جاہل آدمی کے جہل کا علاج سوال کرنا ہے۔ ناواقف آدمی اگر سوال نہ کرے تو اس کی ناواقفیت باقی رہے گی۔ لیکن اگر اس کے اندر سوال کرنے کا مزاج ہو اور وہ دوسروں سے سوال کرے تو کوئی جاننے والا اس کو بتا دے گا، اور اس طرح اس کی بے خبری ختم ہو جائے گی۔

اسی مفہوم میں عربی کا ایک مقولہ ہے کہ : لا ادری نصف العلم۔ یعنی یہ جاننا کہ میں نہیں جانتا، یہ بھی آدھا علم ہے۔ ایک بے خبر آدمی اگر اپنی بے خبری سے لاعلم ہو تو وہ ہمیشہ لاعلمی میں پڑا رہے گا۔ لیکن جب وہ اس ذاتی دریافت تک پہنچ جائے کہ میں فلاں بات کو نہیں جانتا تو وہ اس کی کھوج میں لگ جائے گا۔ وہ اپنے لاادری کو ادری بنانا چاہے گا۔ اس کا یہ جذبہ اس کو علم تک پہنچا دے گا۔ اس کا بے آگہی کا احساس اس کو آگاہی تک پہنچانے کا زینہ بن جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں اس کو روح جستجو (spirit of inquiry) کہا جاتا ہے اور اس کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور سائنس کو ظہور میں لانے والی چیز یہی اسپرٹ آف انکوائری (تلاش و جستجو کی روح) ہے۔ جستجو کی تڑپ نے آدمی کو یافت تک پہنچایا ہے۔

قدیم زمانہ میں انسان فطرت کے مظاہر کو خدائی مظاہر سمجھتا تھا۔ وہ ان کو خدائی کا درجہ دیے ہوئے تھا۔ اس لیے ان کو دیکھ کر اس کے اندر جو چیز جاگتی تھی وہ پرستش کی اسپرٹ (spirit of worship) تھی۔ جب ان مظاہر کو خدائی کے مقام سے ہٹایا گیا تو اس کے بعد انسان کے اندر ان کے بارہ میں تحقیق و جستجو کی اسپرٹ (spirit of inquiry) جاگ اٹھی۔ اس کے نتیجہ میں تمام حقائق فطرت دریافت ہوئے۔

سوال کا مزاج اور تحقیق کا مزاج تمام فکری اور علمی ترقیوں کا زینہ ہے۔ وہی لوگ علم و فکر کی راہ میں بڑی ترقیاں حاصل کرتے ہیں جن کے اندر یہ روح موجود ہو۔ جو لوگ اس روح سے خالی ہوں وہ جامد بن کر رہ جائیں گے۔ وہ ترقی کی اعلیٰ منازل طے نہیں کر سکتے۔

یہی مزاج تمام علمی ترقیوں کی بنیاد ہے۔

خوش خبری

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب امر حق کا اعلان کیا تو آپ کو وہاں کے لوگوں کی طرف سے سخت اذیت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

آپ کی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد فوراً ہی آپ پر ایمان لے آئیں۔ اب تک وہ آپ کی زندگی میں شریک تھیں، اب وہ آپ کی مصیبتوں میں شریک ہوگئیں۔ مخالفین آپ کے گرد جمع ہوکر شور مچاتے طرح طرح سے آپ کو ستانے کی تدبیریں کرتے۔

یہی حالات تھے کہ ایک روز خدا کے فرشتہ جبریل آپ کے گھر آئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ خدیجہ کو ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد جبریل نے کہا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدیجہ کو ایک ایسے گھر کی خوش خبری دے دوں جو موتیوں کا ہے، وہاں نہ شور ہے اور نہ تکلیف (أُمِرتُ أَنْ أُبَشِّرَ خَدِيجَةَ بِبَيْتٍ مِن قَصَبٍ لَا صَخَبَ فِيهِ وَلَا نَصَبَ) سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۵۸

یہ حضرت خدیجہ کے لیے بشارت ہے اور عام اہل ایمان کے لیے نصیحت۔ خدیجہ کے لیے وہ کامیابی کی پیشگی خبر تھی اور دوسروں کے لیے وہ کامیابی کی طرف رہ نمائی۔

مومن کو موجودہ دنیا میں سرکش انسانوں کی طرف سے اذیتیں پیش آتی ہیں۔ ان کا شور اور ان کے اشتعال انگیز الفاظ سننے پڑتے ہیں۔ ایسے موقع پر مومن کو یہ نہیں کرنا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے لڑنے لگے۔ اس کے برعکس مومن کو چاہیے کہ وہ ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ آخرت کی طرف موڑ دے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ خدایا، مجھے ان ناخوش گواریوں پر صبر کی توفیق دے اور میرے لیے جنت میں ایک ایسا گھر بنا دے جہاں نہ کوئی تکلیف ہو اور نہ کسی قسم کا شور وغل۔

دنیا میں ایک آدمی خدا پرستی کا پیغام لے کر کھڑا ہو، اور انسان پرست لوگ اس سے بگڑ کر اس کے خلاف شور وغل کریں۔ وہ اللہ کے لیے عمل کرنے کی طرف پکارے مگر لوگ اس کو ستانے اور پریشان کرنے کے درپے ہو جائیں۔ ان سب کے باوجود وہ صبر کرے تو ایسے شخص کے لیے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کو اگلی دنیا میں قیام کرنے کے لیے ایسا نفیس ماحول دے گا جہاں وہ ابدی طور پر شور اور تکلیف دونوں سے محفوظ رہ کر پُر راحت زندگی گزار سکے۔

مواقع کھونا

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر زیادہ نہ تھی۔ مگر ان کا سوکھا چہرہ اور لاغر جسم بتا رہا تھا کہ وہ قبل از وقت بوڑھے ہو گیے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے دادا کی بہت اونچی پوزیشن تھی۔ میرے والد کے فلاں بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے۔ میں ان ذرائع کو استعمال کر کے بڑے بڑے فائدے حاصل کر سکتا تھا۔ مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ دادا اور باپ دونوں اس دنیا سے چلے گیے۔ اب میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ ماضی کو سوچ سوچ کر کڑھتا رہوں۔ انھوں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا کہ میرا معاملہ مواقع کو کھو دینے کا معاملہ ہے:

Mine is a case of missed opportunities.

میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت میں انسان کا ہونے والا ہے۔ آج کی دنیا میں انسان کے لیے مواقع ہیں۔ وہ ان کو استعمال کر کے آخرت میں اپنا شاندار مستقبل بنا سکتا ہے۔ مگر آج ہر آدمی دوسری دوسری چیزوں میں گم ہے۔ ہر آدمی اپنے قیمتی مواقع کو کھو رہا ہے۔ انسان اسی طرح عمل کے بہترین مواقع کو کھوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مہلت عمر پوری ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا سے اٹھا کر آخرت میں پہونچا دیا جاتا ہے۔

آدمی جب آخرت کے عالم میں پہونچے گا اور وہاں دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سروسامان ہے۔ اس وقت اچانک اس پر کھلے گا کہ میں نے کتنے قیمتی مواقع کو کھو دیا۔ جب کہ وہ مواقع صرف ایک بار ملے تھے، اب وہ مواقع دوبارہ ملنے والے نہیں۔ اس وقت ہر آدمی چیخ اٹھے گا ——— میرا معاملہ مواقع کو کھو دینے کا معاملہ ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ اس مسئلہ پر غور کرے، کیوں کہ دنیا میں کھونا وقتی مدت کے لیے ہوتا ہے اور آخرت کا کھونا ایسا ہے جو ابدی طور پر جاری رہے گا۔

عمل کا موقع جو کچھ ہے صرف آج ہے، کل کسی کے لیے عمل کا موقع نہ ہوگا۔ کل کے دن صرف بھگتنا ہے نہ کہ کرنا۔ بلاشبہ یہ انسانی زندگی کی سنگین ترین حقیقت ہے، مگر اسی سب سے زیادہ سنگین حقیقت کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے۔

حسرت کا دن

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ قیامت کا دن بہت سے لوگوں کے لیے حسرت کا دن ہوگا۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے: یقیناً وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر اچانک آئے گی تو وہ سخت حسرت اور افسوس میں پڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ اس باب میں ہم نے کیسی کوتاہی کی۔ اس وقت وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو، کیسا برا بوجھ ہے جس کو وہ اٹھائیں گے۔ اور دنیا کی زندگی تو بس کھیل اور تماشا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے (الانعام ۳۱-۳۲)

حسرت دراصل کھوئی ہوئی چیز پر غم اور ندامت کا نام ہے (اَلْحَسْرَۃُ اَلْغَمُّ عَلٰی مَا فَاتَہٗ وَالنَّدَمُ عَلَیْہِ، المفردات فی غریب القرآن) قیامت میں جب پردہ ہٹے گا اور تمام حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گی اس وقت آدمی پر کھلے گا کہ دنیا میں کتنا بڑا موقع اس کو ملا تھا مگر وہ اس کو استعمال (avail) نہ کر سکا۔ اس نے ملے ہوئے موقع کو کھو دیا۔

اس وقت آدمی جانے گا کہ میرے لیے موقع تھا کہ میں دنیا میں عمل کر کے آخرت میں اس کا قیمتی انعام حاصل کروں۔ مگر اس واحد موقع کو میں اپنے لیے کارآمد نہ بنا سکا۔ اب دوبارہ عمل کا موقع نہیں۔ اب ابد تک میرے لیے صرف یہ مقدر ہے کہ میں اپنی کوتاہی کا انجام بھگتتا رہوں۔

میرے لیے موقع تھا کہ میں حق کے اعتراف کا کریڈٹ لوں مگر میں نے صرف حق کے انکار کا ثبوت دیا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں خدا کے آگے جھک جاؤں مگر میں خدا کے آگے سرکشی کرتا رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں انصاف والا معاملہ کروں مگر میں برابر بے انصافی کرتا رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں سچے انسانوں کا ساتھ دوں مگر میرا گھمنڈ میرے لیے ان کا ساتھ دینے میں رکاوٹ بنا رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں حق دار کو اس کا حق ادا کروں مگر میں حق دار کو اس کا حق ادا کرنے میں ناکام رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں بے لاگ سچائی کا اعلان کروں مگر میں ہمیشہ مصلحت والی باتیں لکھتا اور بولتا رہا۔ میں نے کھو دیا حالانکہ میرے لیے پانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ یہ حسرت بلاشبہ سب سے بڑا عذاب ہے، اور یہ عذاب ہر اس انسان کے لیے مقدر ہے جس پر موت اس حال میں آئے کہ وہ اپنے دنیا کے مواقع کو اپنی آخرت کے لیے استعمال نہ کر سکا۔

کلام کی دو قسمیں

عن عبد اللہ بن عمر، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ۔ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ قسوۃ للقلب۔ وان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی۔

(رواہ الترمذی)

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کی قساوت کی وجہ سے ہوتا ہے اور جس دل میں قساوت ہو وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے دور ہوتا ہے۔

اس حدیث میں "ذکر" سے مراد معروف معنوں میں کلماتِ ذکر نہیں ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بات کرتے ہوئے بار بار ذکر کے کلمات کو اپنی زبان سے دہراتے رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات کو یادِ خداوندی کی کیفیت سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو یادِ خداوندی کی روح سے بھرا ہوا ہونا چاہیے۔

قساوت کے معنی سختی کے ہیں۔ ارض قاسیہ اس زمین کو کہتے ہیں جو بنجر ہو اور جس میں کچھ نہ اُگے۔ جب یہ لفظ دل کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوگا سخت دل، ایسا دل جو بے حس ہو گیا ہو۔ جن لوگوں کے دلوں میں سختی آجائے، جن کے اندر حساسیت باقی نہ رہے، ان کا کلام ایک قسم کی لسانی ورزش ہوتا ہے۔ ایسے کلام میں تواضع اور خشیت کی روح باقی نہیں رہتی۔ وہ بے حس مشین کی طرح بولتے ہیں نہ کہ اس انسان کی طرح جو خدا کی عظمت وجلال میں غرق ہو کر بول رہا ہو۔

اس کے برعکس جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو، جس کو آخرت کی جواب دہی کے احساس نے گھُلا رکھا ہو، وہ جب بولے گا تو اس کے لفظ لفظ میں اس کی قلبی کیفیت کا رنگ جھلک رہا ہوگا۔ اس کا کلام ایک سنجیدہ انسان کا کلام ہوگا۔ اس کے لہجہ میں دردمندی ہوگی۔ اس کی باتوں میں گہرائی ہوگی۔ اس کی ہر بات میں خدا اور آخرت کی فکر شامل ہوگی۔

بے حس آدمی کے الفاظ انسانی ڈکشنری سے ماخوذ ہوتے ہیں، حساس آدمی کے الفاظ خدائی معرفت سے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کلام میں وہی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو فرق زمین و آسمان کے درمیان ہے۔

حق کی پہچان

قرآن میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کا قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر خدا کا کلام ہے تو وہ عرب کی دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا۔ کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی روزی کو تقسیم کیا ہے۔ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں (الزخرف ۳۱-۳۲)

قدیم عرب میں مکہ اور طائف کو مرکزی شہر کا مقام حاصل تھا۔ ان شہروں میں کچھ لوگ اکابر کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ مثلاً مکہ میں ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ، اسی طرح طائف میں عروہ بن مسعود اور ابن عبد یالیل وغیرہ۔ لوگوں کی نگاہیں انھیں بڑوں پر اٹکی ہوئی تھیں۔ اس لیے جب "محمد بن عبداللہ" نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تو لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ خدا کے پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ وہ عرب کے اکابر میں سے نہیں۔

یہی آدمی کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ لوگ حق کو شخصیتوں کے واسطہ سے پہچانتے ہیں۔ کوئی شخص جو کسی وجہ سے لوگوں کے درمیان شہرت اور بڑائی کا درجہ حاصل کر لے، اس کے کہے ہوئے کو وہ حق سمجھ لیتے ہیں۔ اس قسم کے اعتراف کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصلی اور مطلوب اعتراف یہ ہے کہ آدمی حق کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچانے۔ وہ سچائی کو اس کے غیبی روپ میں دیکھ لے۔

یہ انسان کے امتحان کا سب سے اہم پرچہ ہے۔ اس لیے وہ قیامت تک کسی ایک یا دوسری صورت میں جاری رہے گا۔ جو آدمی اس امتحان میں پورا اترا وہی کامیاب ہے، اور جو شخص اس امتحان میں پورا نہ اترے وہ ناکامیاب۔

حق کو ظاہری عظمت کی سطح پر پانا حق کو پانا نہیں، وہ صرف ظاہری عظمت کو پانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے اعترافِ حق کی کوئی قیمت نہیں۔ حق کو پانے والا وہ ہے جس نے حق کو وہاں پایا جہاں ابھی اس کے ساتھ ظاہری عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا ہمیشہ مخفی روپ میں آتا ہے۔ خدا کو پانے والا صرف وہ ہے جو خدا کو اس کے مخفی روپ میں پالے۔

رسول کی خلاف ورزی

قرآن کی سورہ نمبر ۲۴ کے آخر میں رسول کی اطاعت کی اہمیت بیان ہوئی ہے اور اس کو دنیا اور آخرت کی سعادت کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے :

لاتجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضًا۔ قد یعلم اللّٰہ الذین یتسللون منکم لواذًا۔ فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم (النور ۶۳)

تم لوگ اپنے اندر رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے چلے جاتے ہیں۔ پس جو لوگ رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، ان کو ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو دردناک عذاب پکڑ لے۔

اس آیت میں "دعاء" کا مطلب وہی ہے جو سورہ الانفال (آیت ۲۴) میں دعاء کا مطلب ہے۔ یعنی پیغام۔ شاہ عبدالقادر دہلوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں : حضرت کے بلانے سے فرض ہوتا تھا حاضر ہونا جس کام کو بلائیں۔

اس آیت میں ایک ابدی حکم دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے کامیابی کا طریقہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے، اپنے ہر معاملہ میں رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کو اختیار کرنا۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ دنیا میں کسی سخت مصیبت میں پھنس جائیں اور آخرت میں بھی باز پرس سے دوچار ہوں۔

رسول نے جہاں اقدام کی تلقین کی ہو وہاں کسی مصلحت کی بنا پر اقدام نہ کرنا، جہاں آپ نے صبر اور اعراض کا حکم دیا ہو وہاں بے صبری اور ٹکراؤ کا مظاہرہ کرنا، جہاں آپ نے داخلی اصلاح کی تاکید کی ہو وہاں خارجی اصلاح کے ہنگامے کھڑے کرنا، جہاں آپ نے سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرنے پر زور دیا ہو وہاں غیر ذمہ داری اور جذباتیت کا انداز اختیار کرنا، یہ سب اس میں شامل ہیں۔ اس قسم کی ہر روش سے مسلمانوں کے لیے اسی خرابی کا اندیشہ ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہوا۔

مطلوب عمل

عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَرَأَى اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ جَلَدِهٖ وَنَشَاطِهٖ ، فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ كَانَ هٰذَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلٰى وَلَدِهٖ صِغَارًا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلٰى وَالِدَيْهِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلٰى نَفْسِهٖ يُعِفُّهَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، وَاِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى رِيَاءً وَمُفَاخَرَةً فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ الشَّيْطَانِ (المنذری بحوالہ طبرانی)

کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا۔ آپ کے اصحاب نے اس کی محنت کو اور اس کی سرگرمی کو دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کاش اس کی یہ محنت اور سرگرمی اللہ کے راستہ میں ہوتی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا عمل اللہ کے راستہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنے ماں باپ کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا عمل اللہ کے راستہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنی باعزت روزی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل بھی اللہ کے راستہ میں ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کی دوڑ دھوپ دکھاوے کے لیے اور فخر کے لیے ہو تو اس کا سارا عمل شیطان کے راستہ میں ہے۔

"اللہ کے راستہ میں عمل" کسی خاص شکل والے عمل کا نام نہیں، وہ نیت یا قلبی محرک کا نام ہے۔ جو شخص خدائی نیت کے تحت عمل کرے، اس کا عمل خدا کے راستہ میں ہے۔ جو شخص کسی اور نیت کے تحت عمل کرے، تو اس کا عمل اسی راستہ میں ہے جس کی اس نے نیت کی تھی۔

ایک آدمی کے یہاں چھوٹے بچے ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہ بچے میرے لیے خدا کی ذمہ داری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ ان کی ضروریات فراہم کرتا ہے تو وہ خدا کی راہ میں عمل کرتا ہے۔ ایک آدمی کے یہاں بوڑھے والدین ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ والدین کی خدمت میرے اوپر خدائی فریضہ ہے۔ اس احساس کے تحت وہ اپنے والدین کی خدمت کرتا ہے تو وہ خدا کی راہ میں عمل کر رہا ہے۔ ایک شخص کے سامنے اپنے فطری تقاضے ہیں۔ وہ شریعت الٰہی کے دائرہ میں اپنی فطری حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے سرگرم ہوتا ہے تو وہ خدا کی راہ میں عمل کرتا ہے۔

شک سے بچئے

جو لوگ آخرت کو (یا امور غیب کو) نہیں مانتے، وہ کس نفسیات کے تحت ایسا کرتے ہیں، اس کو قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کے بارہ میں ان کا علم الجھ گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (بل ادّارك علمهم في الآخرة بل هم في شك منها بل هم منها عمون) النمل ۶۶

اس آیت میں اِدّارَکَ کا لفظ بے حد اہم ہے۔ ادّارک کی اصل تدارک ہے۔ پھر ادغام کے اصول کے مطابق، ت کا حرف دال میں مدغم ہو گیا (لسان العرب ۱۰/۱۹۴) ادّارک یا تدارک کے ابتدائی معنی ہیں باہم مل جانا۔ قرآن میں ہے کہ حتیٰ اذا ادّارکوا فیها جمیعا (یہاں تک جب وہ سب لوگ اس میں اکٹھا ہو جائیں گے)

مختلف چیزیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو اس کا ایک نتیجہ اختلاط کی صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی چیزیں باہم مل کر گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ادّارک میں اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ مذکورہ آیت میں اس لفظ کا یہی نتیجہ والا مفہوم مراد ہے۔ یعنی آخرت کے بارہ میں مختلف رایوں کی وجہ سے ان کے اندر ذہنی الجھن کی کیفیت پیدا ہوئی جو بالآخر شک اور اندھے پن تک پہنچ گئی۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر یہاں التباس (الانعام ۹) کا قانون جاری ہے۔ یہاں حقیقتوں کو برہنہ صورت میں نہیں لایا جاتا بلکہ ملتبس صورت میں لایا جاتا ہے۔ کوئی حقیقت خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ ثابت کر دی جائے، ایک عنصر اس میں اشتباہ والتباس کا باقی رہتا ہے۔ یہی چیز شک کا باعث بنتی ہے۔ آدمی اس شک والے پہلو کو لے کر طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایسا ہو جاتا ہے گویا وہ اندھا ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

یہ شک کا پہلو امتحان کا تقاضا ہے۔ اس لیے وہ لازماً موجود رہے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر شک کے پردہ کو پھاڑے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس دنیا میں کبھی یقین کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

شک سے بچئے۔ شک تمام گمراہیوں کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔

تنقید، نزاع

قرآن میں داعی کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مدعو (مخاطب) سے نزاع کرے۔ داعی پر لازم ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں اور اس کی اشتعال انگیز باتوں پر یک طرفہ طور پر صبر کرے۔ وہ ہرگز ردعمل کا انداز اختیار نہ کرے۔ یہ ہدایت اس لیے دی گئی ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا برہم نہ ہونے پائے جو دعوت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

وہ کون سی نزاع ہے جس سے داعی کو پرہیز کرنا ہے۔ قرآن کے مطابق وہ دو قسم کی ہے۔ ایک یہ کہ مادی چیزوں کے معاملہ میں مدعو سے جھگڑا کیا جائے۔ مثلاً مدعو سے معاشی حقوق کی جنگ چھیڑنا۔ مدعو سے مطالبہ کرنا کہ تم ہمارے خلاف نعرہ نہ لگاؤ، اور اگر وہ مخالفانہ نعرہ لگائے تو اس سے لڑ پڑنا۔ مدعو کو نقصان پہنچا کر اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کرنا، وغیرہ۔ داعی کو چاہیے کہ اس طرح کے معاملات میں وہ خود صبر کرلے، وہ مدعو کے خلاف احتجاجی مہم یا حقوق طلبی کی سیاست نہ چلائے۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ مدعو کو خطاب کرنے میں سب وشتم یا مناظرہ و مجادلہ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ واقعات و حقائق کی زبان میں کلام کیا جائے، داعی کا جدال ہمیشہ جدال احسن ہوتا ہے۔ داعی اپنی بات کو دلائل پر مبنی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔

داعی کو جس نزاع سے منع کیا گیا ہے، اس کا کوئی تعلق تنقید سے نہیں ہے۔ کلمہ اسلام (لا الٰہ الا اللہ) میں شرک کی تردید پہلے ہے اور توحید کا اثبات اس کے بعد۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید، دعوت کا لازمی جزء ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تنقید بھی مدعو کو بری معلوم ہو۔ وہ تنقید کو سن کر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود دعوت میں تنقید کا اسلوب اختیار کیا جائے گا۔ کیوں کہ دعوت کا اصل مقصد احقاق حق اور ابطال باطل ہے، ایسی حالت میں اگر تنقید کا انداز نہ اختیار کیا جائے تو اس کے بعد دعوت کی وضاحت ہی ناممکن ہو جائے گی۔

سچی تنقید اپنی حقیقت کے اعتبار سے تبیین ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کی استدلالی وضاحت ہے۔ ایسی تبیین اور وضاحت لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر مخاطب کے اوپر حق کی پیغام رسانی کا اتمام نہیں ہو سکتا۔

مذہب کی طرف

انیسویں صدی مذہب سے انکار کی صدی تھی۔ مگر بیسویں صدی کے آتے ہی تاریخ بدل گئی موجودہ صدی میں، خاص طور پر، دو واقعات ایسے پیش آئے جس کے بعد مذہب دوبارہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ انسانی زندگی میں واپس آگیا ہے، اگرچہ بالفعل کم، مگر بالقوہ مکمل طور پر۔

۱۔ سائنس سے عدم اطمینان

۲۔ فطرت کی سطح پر مذہبی احساس کا ختم نہ ہونا۔

ایک سو سال پہلے یہ حال تھا کہ سائنس کے خلاف سوچنا بھی جہالت سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں ایک مشہور سائنس داں نے کہا تھا کہ میں کسی چیز کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ میں اس کا سائنٹفک ماڈل نہیں بنالیتا۔ مگر اب، کم از کم علمی سطح پر، سائنس کی افادیت کے بارے میں انسان کا یہ یقین متزلزل ہوچکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سلسلہ میں کافی لٹریچر شائع ہوچکا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تاریخ سائنس کا مختصر مقالہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:

ابھی حال تک سائنس کی تاریخ فتح کی تاریخ تھی۔ علم کے افسانہ سے سائنس کی کامیابیاں، توہمات اور ناواقفیت پر سائنس کی فتوحات نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ سائنس کے ذریعہ دریافتوں کا سیلاب جاری ہوا جس نے انسانی ترقی کو آگے بڑھایا۔

مگر حال میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ خود سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ خارجی طاقتیں اور اس کے ترقیاتی عمل کو لاحق ہونے والی رکاوٹیں اور ٹکنالوجی کے لامحدود استعمال کے خطرات تاریخ دانوں کو چیلنج کر رہے ہیں کہ وہ سائنس کے بارہ میں سابقہ سادہ عقیدہ کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں (16/366)

جدید سائنس نے انسان کو بہت سی سہولتیں دی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے انسان کے لئے اتنا بڑا خطرہ بھی پیدا کر دیا جو اس کے تمام عطیات کو بے معنی قرار دے دیتا ہے۔ یہ تیسری عالمی جنگ کا

خطرہ ہے۔ اگر یہ جنگ چھڑی، تو وہ ایک انتہائی خوفناک جوہری جنگ (nuclear war) ہوگی جو اکثر بڑے شہروں کو چند گھنٹوں کے اندر کھنڈر بنا دے گی۔ مزید یہ کہ اس جنگ کے بعد فضا میں نہایت گہرا دھواں چھا جائے گا جو سورج کی روشنی کو زمین تک پہنچنے نہ دے گا۔ اس طرح ایک ہولناک قسم کا جوہری جاڑا (nuclear winter) شروع ہوگا جو زمین پر نباتات، حیوانات اور انسان کو بدترین موت کے کنارے پہنچا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

سائنس کے پیدا کردہ مسائل میں سے ایک سنگین مسئلہ وہ ہے جس کو فضائی کثافت (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔ سائنس نے ٹکنالوجی پیدا کی۔ ٹکنالوجی نے مشینیں ایجاد کیں۔ ابتداءً جب لوگوں نے سڑکوں پر کاروں کو دوڑتے ہوئے دیکھا اور یہ دیکھا کہ کارخانے ان کے لئے ہر قسم کا سامان تیار کر رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوگئے۔ مگر جلد ہی انھیں معلوم ہوا کہ یہ ترقی انھیں اس قیمت پر ملی ہے کہ اس نے مضر گیسیں بکھیر کر ہوا کو اس قابل نہیں رکھا کہ انسان اس میں مفید طور پر سانس لے سکے۔ چنانچہ ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے کہ موجودہ انسان کو جو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہے وہ ہوائی کثافت ہے۔ اس کے الفاظ میں انسانی نسل جس مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان صنعتی تہذیب کے پیدا کردہ کثیف پنجرہ (Polluted cage) میں بند ہو کر رہ جائیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جون ۱۹۸۹) میں امریکی حکومت کے شائع کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بتایا گیا تھا کہ امریکہ کے صنعتی کارخانے ہر سال ۱۶۳ ملین کیلوگرام کے بقدر ایسا دھواں فضا میں انڈیل رہے ہیں جو کینسر پیدا کرنے والا ہے۔ صرف ۳۰ بڑے امریکی کارخانے جو ہوائی کثافت پیدا کر رہے ہیں وہ فی کارخانہ ساڑھے چار لاکھ کیلوگرام سے زیادہ ہے:

US industrial plants are spouting 163 million Kg of suspected cancer-causing chemicals into the air annually, with releases from each of the 30 biggest polluters exceeding 450,000 kilograms, reports AP, quoting government statistics.

امریکہ میں ۱۹۷۰ میں ہوا کی صفائی کا قانون (Clean Air Act) پاس کیا گیا تھا۔ مگر فضائی کثافت میں پچھلے ۲۰ سال میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ امریکہ کے فضائی حفاظت کے ادارہ

(U.S. Environmental Protection Agency) کے مطابق، امریکہ اس وقت ۳۰
ہزار ملین ڈالر سالانہ صرف فضائی کثافت کو کنٹرول کرنے پر خرچ کر رہا ہے۔ مگر موجودہ کوششیں ناکام ثابت ہو رہی ہیں، اس لئے اب تجویز کیا گیا ہے کہ زیادہ موثر ذرائع اختیار کرنے کے لئے اس رقم کو دگنا کر دیا جائے (اسپان، اگست ۱۹۸۹)

سائنس کی ترقی نے صرف مادی مسائل ہی پیدا نہیں کئے بلکہ اسی کے ساتھ نہایت سنگین قسم کے ذہنی اور روحانی مسائل بھی پیدا کر دئے۔

۱۔ سائنس اور سائنسی ذرائع نے انسانی علم کو بے حد وسیع کر دیا تھا۔ اس نے انسان کو نہ صرف خوردبین اور دوربین دی جس سے وہ ان چیزوں کو دیکھ لے جو اب تک دیکھی نہیں جا سکی تھیں۔ بلکہ بے شمار نئے نئے ذرائع انسان پر کھول دئے جس سے ہر میدان میں معلومات کا بے پناہ اضافہ ممکن ہو گیا۔

اس کی وجہ سے انسان کے اندر یہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ وہ کسی اور سہارے کے بغیر صرف اپنی سائنس کے ذریعہ آخری حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، مگر علم کے اضافے نے انسان کو صرف یہ بتایا کہ وہ لاعلمی کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، ہم صرف یہ کر رہے ہیں کہ ہم کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان رہے ہیں:

We are knowing more and more about less and less.

۱۹ ویں صدی کے آخر تک سائنس داں یہ سوچتے تھے کہ وہ علم کے اضافے کے ساتھ آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کے نصف اول میں جو تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان آخری حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان کی محدودیتیں (LIMITATIONS) فیصلہ کن طور پر آخری حقیقت تک پہنچنے میں حائل ہیں۔ اہل سائنس کے درمیان اب مسلّمہ طور پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ سائنس ہم کو حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

۲۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد اہل علم کے درمیان یہ ایک فیشن بن گیا تھا کہ کائنات

کی تعبیر خدا کے بغیر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہر معاملہ میں ایسی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی جس سے یہ ثابت ہو کہ کائنات کے پیچھے کوئی ذہن یا شعور نہیں۔ مگر کائنات کی غیر خدائی تشریح کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔

ہندستان کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر سبرامنیم چندر شیکھر جن کو ۱۹۸۳ میں فزکس کا مشترکہ نوبیل پرائز ملا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ملحد (atheist) کہتے ہیں۔ انھوں نے اس معاملہ میں سائنس کی موجودہ پوزیشن کا خلاصہ چند لفظوں میں اس طرح بتایا ہے:

There are aspects which are extremely difficult to understand. A famous remark of Einstein – and other people have said similar things, Schrodinger in particular – that the most incomprehensible thing about nature is that it is comprehensible. How is it that the human mind, extremely small compared to the universe and living over a time span microscopic in terms of astronomical time, comprehend reality in ideas which spring from the human mind? This question has puzzled many people from Kepler on. Why should mathematical description be accurate? Mathematical description is something the human mind has evolved. Why should it fit external nature? We do not have answers to these questions. One is not saying the world is orderly and therefore must be ordered. But why should we understand the world in terms of the concepts we have developed?

The Hindustan Times, May 31, 1987, New Delhi.

کائنات میں ایسے پہلو ہیں جن کا سمجھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ آئنسٹائن اور دوسرے سائنس دانوں نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ شرو ڈنگر کے الفاظ میں فطرت کے متعلق سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے۔ ایسا کیوں کر ہے کہ انسانی دماغ جو کائنات کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹا ہے اور فلکیاتی وقت کے مقابلہ میں جس کی مدت بہت ہی کم ہے، وہ حقیقت کو ایسے خیالات کے ذریعہ سمجھتا ہے جو انسانی دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس سوال نے کپلر سے لے کر اب تک بہت سے لوگوں کو سراسیمہ کر رکھا ہے۔ کیوں یہ ضروری ہے کہ ریاضیاتی تشریحات بالکل درست ہوں۔ ریاضیاتی تشریح ایک ایسی چیز ہے جس کو انسانی دماغ نے ایجاد کیا ہے۔ پھر کیوں وہ خارجی فطرت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ ہم ان سوالات کا جواب نہیں جانتے۔ اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں نظم ہے اس لئے اس کا کوئی ناظم ہونا چاہئے۔ مگر کیوں ایسا ہے کہ ہم کائنات کو ان اصطلاحوں میں سمجھتے ہیں جن کو ہم نے خود وضع کیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) نے کہا تھا کہ وہ حکمت کہاں ہے جو ہم نے علم میں کھو دی۔ وہ علم کہاں ہے جس کو ہم نے معلومات میں کھو دیا:

Where is the wisdom that we have lost in knowledge?
Where is the knowledge that we have lost in information?

۱۹۸۹ میں خاص اسی موضوع پر ایک خاتون مصنف کی کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Wisdom, Information and Wonder, by Dr Mary Midgley

ان چیزوں نے ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر میں انسان کے اندر نیا ذہن پیدا کیا ہے۔ نہ صرف "آزاد دنیا" میں بلکہ کمیونسٹ ملکوں میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس تبدیلی کی خبریں اخبارات میں اور رسائل میں مسلسل دیکھی جاسکتی ہیں۔

امریکہ میں پروفیسر کاکس (Harvey R. Cox) کی ایک کتاب ۱۹۶۵ میں چھپی تھی۔ اس کا نام تھا سیکولر شہر (The Secular City) اس میں مصنف نے دکھایا تھا کہ اب لوگوں نے مذہب میں اپنی دل چسپی کھو دی ہے۔ مگر اسی مصنف کی دوسری کتاب ۱۹۸۴ میں چھپی ہے جس کا نام ہے سیکولر شہر میں مذہب (Religion in the Secular City) یہ دوسری کتاب بتاتی ہے کہ امریکہ (اور اسی طرح دوسرے مغربی ممالک میں) مذہب از سر نو زندہ ہو رہا ہے۔

حال میں اس موضوع پر کثرت سے کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کا ایک خلاصہ امریکی میگزین اسپان (Span) کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۴ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مصنف فران شومر (Fran Schumer) ہیں اور اس کا عنوان ہے:

A Return to Religion

اس مضمون کی تفصیل "عقلیات اسلام" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ امریکہ کی نئی نسل محسوس کر رہی ہے کہ مذہب کو چھوڑ کر وہ بے جڑ (Rootless) ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ از سر نو مذہب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں، مذہب دوبارہ ایجنڈا پر ایک مثبت طاقت کے ساتھ واپس آگیا ہے:

Tradition is back on the agenda
with a positive force (p. 29).

اسلامی دعوت کے مواقع

مذہب کی طرف واپسی دراصل اسلام کی طرف واپسی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مذہب کا صحیح نمائندہ صرف اسلام ہے۔ جو لوگ فی الواقع مذہب کے طالب ہوں اور وہ اپنی اس طلب میں سنجیدہ ہوں وہ اگر اسلام کو جان لیں تو یقینی طور پر وہ اسلام ہی کو اپنا مذہب بنانے کا فیصلہ کریں گے۔ کیوں کہ وہ "مذہب کے نام سے جس چیز کو تلاش کر رہے ہیں وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے دین کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ اپنے اس مطلوب کو زیادہ سے زیادہ موثر اور کارگر بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو انتظامات کئے ہیں، ان میں سے ایک خاص انتظام یہ ہے کہ اس نے اپنے آخری دین کو مکمل طور پر محفوظ بنا دیا۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام کا محفوظ اور تاریخی مذہب ہونا اس کو اجارہ داری کی حد تک واحد قابل اعتنا مذہب بنا دیتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت نے ایک طرف اسلام کی پیغام رسانی کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔ اسلام کے ماننے والے اگر خود اپنی نادانی سے غیر ضروری طور پر کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں تو وہ بلا روک ٹوک اسلام کی تبلیغ کا عمل جاری رکھ سکتے ہیں۔

اسلام کی اس خصوصیت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام آج لوگوں کے لئے حد درجہ قابل قبول مذہب بن چکا ہے۔ اب ساری رکاوٹیں ختم کی جا چکی ہیں۔ اب اصل کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خالص مثبت انداز میں اسلام سے متعارف کر دیا جائے۔ اس کے بعد لوگ خود اپنے جذبہ کے تحت اس کی طرف کھنچ آئیں گے۔ وہ اس کو خود اپنی طلب کا جواب سمجھ کر اسے اختیار کریں گے۔

مذہب کی طرف واپسی، اپنے امکان کے اعتبار سے، اسلام کی طرف واپسی ہے۔ کون ہے جو اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے اٹھے، کون ہے جو خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شریک کرے۔

اسلامی حل

ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقہ میں آج کل کثرت سے یہ سوچا جارہا ہے کہ کیا ہندوازم میں "ریفارم" کی ضرورت ہے۔ اس کا اظہار اکثر اخبارات ورسائل میں ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۲۴ اپریل ۱۹۹۱) میں مسٹر روندر کمار کا ایک مفصل مضمون چھپا ہے جس میں انھوں نے اس جدید رجحان کا جائزہ لیا ہے جس کو انھوں نے ہندوازم کو سامی بنانا (Semitisation of Hinduism) قرار دیا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے :

Contemporary Hinduism: Existential or Instrumental Religion

اسی طرح ٹائمس آف انڈیا (۱۳ مئی ۱۹۹۱) میں مسٹر سواپن داس گپتا کا مضمون چھپا ہے۔ اس کے عنوان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہندوازم کو سامی مذاہب کے مطابق بنا دینا چاہیے :

Hinduism Should be Semitised

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں مختلف تجدیدی تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ پہلے ماڈرنائزیشن کی تحریک تھی، پھر سیکولرائزیشن کی تحریک چلی، اور اب سیمیٹائزیشن کی تحریک چل رہی ہے :

First it was modernisation, then it was secularisation, and now it is semitisation.

مضمون نگار نے اگرچہ اس قسم کی تحریکوں کو "اینٹی ہندو" تحریک قرار دیا ہے۔ تاہم انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ہندوازم میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جو سامی مذاہب میں نہیں ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال، ان کے نزدیک، ذات پات کا نظام (casteism) ہے جس کا ہندوازم کے ڈھانچہ میں کوئی حل نہیں۔ البتہ ہندوؤں کے ذات پات کے غیر مساوی نظام کو سامی مذاہب (مثلاً اسلام) کے مساوات پر مبنی سماجی نظام کی مدد سے ختم کیا جاسکتا ہے۔

سوامی ویویکانند نے پچھلی صدی کے آخر میں اپنے ایک مطبوعہ خط مورخہ ۱۰ جون ۱۸۹۸ میں یہ اعتراف کیا تھا کہ ہندوازم میں ادویت واد کا نظریہ تمام چیزوں میں کامل یکتائی کو مانتا ہے۔ مگر عملی ادویت واد (Practical Advaitism) کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہوسکی۔ اگر کسی مذہب نے

تاریخ میں کبھی عملی ادویت واد اور مساوات (equality) کو بالفعل انسانی سماج میں قائم کیا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ سوامی ویویکانند کی یہ تاریخی تحریر ہر دردمند ہندستانی کے لیے بے حد قابل غور ہے۔

سوامی ویویکانند نے مذکورہ خط میں اپنا یہ قطعی خیال ظاہر کیا ہے کہ پریکٹیکل اسلام کی مدد کے بغیر ویدانت کے نظریات بالکل بے قیمت ہیں۔ وسیع انسانیت کے لیے ان نظریات کا کوئی فائدہ نہیں۔ سوامی ویویکانند نے مزید لکھا ہے کہ ہمارے مادرِ وطن کے لیے واحد امید یہ ہے کہ یہاں دونوں مذہبوں ہندوازم اور اسلام کا میل ہو سکے۔ مستقبل کا معیاری ہندستان اس طرح وجود میں آسکتا ہے کہ یہاں ویدانت برین کے ساتھ اسلام باڈی کو شامل کیا جائے اور دونوں کی مدد سے سماج کی تشکیل کی جائے :

Letters of Swami Vivekananda, Calcutta, pp. 379-80

میں کہوں گا کہ خرابیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک عملی، اور دوسری نظریاتی۔ اگر کوئی جزئی نوعیت کی عملی خرابی ہو تو ایسی حالت میں جوڑ اور پیوند کا طریقہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں مسئلہ فکری اور نظریاتی ہو، وہاں اس قسم کا جوڑ کارآمد نہیں۔ جو عملی خرابی کسی فکری خامی کا نتیجہ ہو، اس کو فکری خامی کی اصلاح کے بغیر درست نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوازم میں ذات پات کا نظام صرف ایک عملی خرابی کی بات نہیں، وہ عین ہندو فکر اور ہندو فلسفہ کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں خود اس کے فلسفہ پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ سادہ طور پر صرف عملی اصلاح کی کوشش اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ اپر کاسٹ کے ہندوؤں نے ایک پولیس کو توال امباداس ساو نے (۳۰ سال) کو پتھروں اور لاٹھیوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ پربھنی کے ایک گاؤں میں ۱۶ اگست ۱۹۹۱ کو ہوا۔ امباداس ساو نے کا قصور یہ تھا کہ وہ لور کاسٹ سے تعلق رکھتا تھا اور بارش سے بچنے کے لیے مقامی ہنومان مندر کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۹ اگست ۱۹۹۱)

جو لوگ نچلے طبقہ کے خلاف اس قسم کا وحشیانہ سلوک کرتے ہیں وہ اپنے اُس یقین کے تحت کرتے ہیں جو اپنے مذہبی عقیدہ کی رو سے انھیں حاصل ہے۔ اس لیے جب تک مذہبی عقیدہ کی اصلاح نہ ہو اس برائی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور یہ مقصد صرف عقیدۂ توحید کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے

وسط ایشیا

سمرقند وسط ایشیا (سنٹرل ایشیا) کا ایک قدیم مسلم شہر ہے۔ ۱۹۲۸ میں کمیونسٹ فوجوں نے یہاں کے مسلم نواب کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک روسی لیڈر نے کتاب لکھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ اسی زمانہ میں "سمرقند کے اوپر صبح" کے نام سے شائع ہو چکا ہے :

Dawn over Samarkand

اس کتاب میں کمیونسٹ مصنف نے فخر کے ساتھ لکھا تھا کہ ——— سمرقند کا ملا چیختا رہا۔ مگر ہماری توپوں کے گولے اس کی چیخ پر بھاری ثابت ہوئے اور ہم نے اس مسلم شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے ساٹھ سال بعد اشتراکی ایمپائر کی حربی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اب اس کے پاس روایتی توپوں کے بجائے ۳۰ ہزار کی تعداد میں ایٹم بم موجود تھے۔ مگر وہ اتنا بے بس ہوا کہ اپنے بموں کو استعمال کرنے کی طاقت بھی اس کے اندر نہ رہی۔ ایٹم بموں اور دوسرے جدید ہتھیاروں کی کثرت کے باوجود اس کا پورا ڈھانچہ تاش کے پتوں کی طرح ڈھ پڑا۔

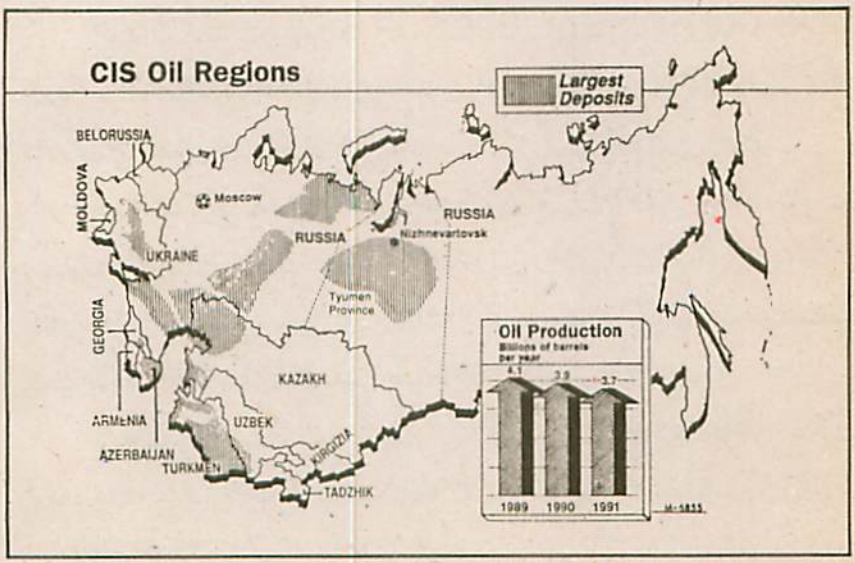

اشتراکی صبح نہ صرف سمرقند کے لیے بلکہ پورے سوویت یونین کے لیے صرف اندھیرا ثابت ہوئی۔ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین اپنی بدترین کمزوریوں کا شکار ہو کر ٹوٹا تو اسی کے ساتھ نہ صرف سمرقند بلکہ وسط ایشیا کی نصف درجن مسلم ریاستیں (آذربائیجان، قازقستان، کرغیزیہ، تاجکستان، ترکمانستان، ازبکستان) بھی اچانک آزاد ہوگئیں۔ ۱۹۹۱ سے پہلے جہاں سرخ پرچم لہرا رہا تھا وہاں اب ایک وسیع علاقہ میں ایک طاقت ور مسلم بلاک وجود میں آگیا ہے۔

سوویت یونین کے غلبہ کے زمانہ میں حکومت نے ہر طرح اس علاقہ میں روسی زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرکاری طور پر روسی زبان کو ثقافتی برتری (Cultural supremacy) دینے کی تمام تدبیریں کی گئیں۔ مگر یہ تدبیریں ناکام رہیں۔ مجھے اپنے سفر روس (جولائی ۱۹۹۰) میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں کے مسلمان روسی کے ساتھ ترکی اور فارسی زبانیں بھی جانتے ہیں اور آپس میں ان زبانوں کو بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کمیونسٹ قبضہ کے بعد روسی تہذیب کو پورے علاقہ میں غالب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کوشش کو عام طور پر سلاونائزیشن (Slavonisation) کہا جاتا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت مسلمانوں کے اسلامی نام بدلے گئے۔ مثلاً نیازکو نیازوف، نظر کو نظربائیوف، سلطان کو سلطانوف وغیرہ۔ سنٹرل ایشیا کے ماہر ڈاکٹر ڈینیل پائپس (Daniel Pipes) نے لکھا ہے کہ روسی سیاست اور روسی کلچر کی اس توسیع کی بنا پر مغربی علماء وسط ایشیا کو یورپ کی آخری بڑی کالونی (Last great colony) کہنے لگے تھے۔

لندن اور قاہرہ کے درمیان جو فاصلہ ہے وہی فاصلہ ماسکو اور تاشقند کے درمیان ہے۔ تاہم روسی حکمراں ۱۵۵۲ سے ہی اس علاقہ میں سیاسی مداخلت کرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۷ میں اشتراکی انقلاب کے بعد یہ تدخل زیادہ بڑھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ کے بعد یہاں حدیدی نظم (Iron discipline) قائم کر دیا گیا۔

اعداد و شمار کے مطابق، ۱۹۳۹ میں پورے سوویت یونین میں مسلم آبادی کا تناسب ۸ فی صد سے کچھ زیادہ (8.7 Per cent) تھا۔ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۹۰ میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹ فی صد سے زیادہ (19.9 Per cent) ہوگئی۔ اس مدت میں غیر مسلم آبادی میں اضافہ کی

شرح تقریباً ۵۱ فی صد تھی۔ جب کہ مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح ۲۰ فی صد تک پہنچ گئی۔ سوویت یونین اگر باقی رہتا تو عنقریب سوویت فوج میں ہر تین فوجی میں سے ایک مسلمان ہوتا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کرغیزیہ کی راجدھانی اوش (Osh) کو دوسرا مکہ کہا جاتا ہے۔ آذربائیجان میں شیعوں کی اکثریت ہے۔ مگر مجموعی طور پر اس علاقہ کے مسلمان زیادہ تر سنی ہیں۔

وسط ایشیا کی ان آزاد مسلم ریاستوں کی واحد کمی یہ ہے کہ وہ سمندری ساحل سے محروم (Land locked) ہیں۔ یہ کمی پڑوسی مسلم ملکوں (ترکی، ایران، پاکستان) کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ترکی سب سے پہلا ملک تھا جس نے الماآتا (Alma Ata) کے فیصلہ کے بعد ان ریاستوں کو آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ ایران نے اپنی سرحد تک ریلوے لائن بچھانے میں مدد دینے کی پیش کش کی ہے۔ پاکستان نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان کے راستہ سے پاکستان کی بندرگاہوں تک خشک راستہ (Land route) دینا منظور کیا ہے۔ ان ریاستوں کے لیے ترکی کے راستہ سے میڈیٹرینین تک پہنچنا بہت آسان ہے۔

ایک مبصر کے الفاظ میں، یہ علاقہ امکانات سے بھرا ہوا ہے :

The religion is full of possibilities.

ازبکستان کپاس کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ قازقستان میں تیل کے ذخائر ہیں۔ تاجکستان زراعت کے لیے بہت موزوں ہے۔ ترکمانستان میں کپاس کی پیداوار کے وسیع امکانات ہیں۔ کرغیزیہ زراعت کے وسائل سے مالا مال ہے۔ آذربائیجان میں کثیر تعداد میں تیل کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔

ایک مبصر نے کہا ہے کہ اشتراکیت کی موت کے بعد یہ امید کرنا بالکل فطری ہے کہ اس خطہ میں اسلامی نظریہ کو قائم کرنے کا رجحان ابھرے گا :

It would be natural to expect that with the death of communism there would be a trend towards establishment of Islamic ideology in the six republics.

حقیقت یہ ہے کہ سابق سوویت یونین کے زیر اقتدار ان مسلم ریاستوں کے آزاد ہونے کے بعد، جغرافی نقشہ پر ایک عظیم مسلم بلاک وجود میں آگیا ہے۔ اگر یہ پورا بلاک متحد ہو جائے تو قریبی مستقبل میں بلاشبہ اسلام دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔

فطرت کی آواز

محمد اسرائیل صاحب بی ایس سی (۲۴ سال) الور کے رہنے والے ہیں۔ ان سے ۴ جنوری ۱۹۹۲ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں اور دوسروں کو بھی الرسالہ پڑھاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔

انھوں نے کہا کہ الور کے گورنمنٹ کالج میں ۱۹۹۰ میں وہ اور مسٹر مدن لال قریب قریب رہتے تھے۔ مسٹر مدن لال وہاں ایم اے ہسٹری کے طالب علم تھے۔ اسرائیل صاحب نے ان کو الرسالہ انگریزی کا ایک شمارہ پڑھنے کے لیے دیا۔ چند دن کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نے اس میگزین کو پڑھ لیا۔ تاثر پوچھنے پر انھوں نے کہا: اس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی رائٹر نہیں بول رہا ہے بلکہ انسان کا نیچر بول رہا ہے۔

یہ بلاشبہ صحیح ترین تبصرہ ہے۔ الرسالہ میں اسلام کا پیغام ہوتا ہے۔ اور اسلام کی بات جب بے آمیز صورت میں پیش کر دی جائے تو وہ عین انسانی نیچر کی بات بن جاتی ہے۔ کیوں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اسلام فطرت انسانی کا مثنی ہے۔ اسلام انسان کا خود اپنا مطلوب ہے۔

قدیم زمانہ میں مذہبی تعصب بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ یہی مذہبی تعصب پیغمبروں کی بات کو سمجھنے اور ماننے میں رکاوٹ بنتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید افکار اور جدید تعلیم نے مذہبی تعصب کو ختم کر دیا ہے۔ اب انسانی فطرت سے وہ مصنوعی پردہ ہٹ گیا ہے جو قدیم زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اسلام اب انسان کے لیے عملاً اتنا ہی قابل قبول بن چکا ہے جتنا پانی کسی پیاسے آدمی کے لیے۔

اب اہل اسلام کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ایسی ہر کارروائی سے بچیں جو ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی فضا پیدا کرنے والی ہو۔ اور پھر اسلام کو اس کی سادہ صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ اس کے بعد غیر مسلم قومیں اسلام کو خود اپنے دل کی آواز سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑیں گی۔

اسلام کی نفی کرنا خود اپنی نفی کرنا ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی نفی کرنے کی قیمت پر کسی چیز کا انکار کرے۔

یہاں سنگاپور کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بزنس منیجر تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ جاپان کس لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ صرف سیکھنے کے لئے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ جاپان کی کس بات نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ صرف سیکھنے کے لئے یہاں آگئے۔ انھوں نے کہا کہ میں جاپان کی صنعتی ترقی کے بارہ میں بہت کچھ سنتا اور پڑھتا تھا۔ مگر ایک واقعہ میں نے پڑھا۔ اس نے مجھے تڑپا دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھ کو جاپان جا کر وہاں سے کچھ حاصل کرنا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ واقعہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور ایک انگریزی میگزین نکالا۔ اس میں حسب ذیل واقعہ چھپا ہوا تھا:

The story is told of a Swedish expert who went to Japan to study workers' participation in management. In one factory, in the middle of an interview, he was gravely embarrassed when the Japanese worker burst into tears. Finding no response from the worker, the Swede sought an answer from his supervisor. "Tell me everything that you said to the worker," confidently after listening to his story, "the worker was upset when you told him that his company has not been procuring export orders like before." The worker, the Swede was told was deeply concerned that the nation would suffer if the exports went down, a fact which could be attributed, in his own estimation, to a lowering of quality.

سویڈن کے ایک ماہر کا قصہ بتایا جاتا ہے۔ وہ جاپان گیا تاکہ انتظام میں کارکنوں کی شرکت کا مطالعہ کرے۔ ایک کارخانہ میں وہ ایک کارکن سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت متاثر ہوا جب اس نے دیکھا کہ اس کے ایک سوال پر جاپانی کارکن بے اختیار رو پڑا۔ جب اس کو کارکن کی طرف سے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تو اس نے سپروائزر سے اس کی بابت پوچھا۔ سپروائزر نے کہا کہ جو کچھ آپ نے اس سے کہا ہے وہ سب مجھے بتائیے۔ پورا قصہ سننے کے بعد سپروائزر نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ جب آپ نے کارکن کو بتایا کہ تمہاری کمپنی آجکل برآمدی فرمائشوں کی تعمیل پہلے کی طرح نہیں کر رہی ہے تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جاپانی کارکن کو اس کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے کہ اگر برآمد گھٹ گئی تو اس سے

پوری قوم کا نقصان ہوگا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کو جاپانی کارکردگی کا معیار گھٹنے سے تعبیر کیا جائے گا۔

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ جاپان کا ایک انسان اپنی قوم کے بارہ میں اتنا حساس ہے کہ وہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی کسی کوتاہی سے اس کی قوم پر حرف آئے۔ مگر موجودہ مسلمان اپنے دین کے بارہ میں اس طرح حساس نہیں۔ وہ مسلسل غلطیاں اور نادانیاں کر رہے ہیں۔ مگر یہ احساس ان کو نہیں تڑپاتا کہ اس کی وجہ سے ان کا دین دوسری قوموں کی نظر میں بدنام ہو جائے گا۔

مجھے اپنے بچپن کے زمانہ کی بات یاد ہے۔ یہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کا زمانہ تھا۔ اس وقت "میڈ ان جاپان" کے معنی ہوتے تھے معمولی اور کمزور چیز۔ اس زمانہ میں عام طور پر کھلونے وغیرہ جاپان سے آتے تھے اور سستی قیمت پر بازار میں بکتے تھے۔ یہاں میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جاپان اپنے قدیم دور سے جدید دور تک کیسے پہنچا جب کہ ماضی کے برعکس "میڈ ان جاپان" کا لفظ معیاری مصنوعات کا عنوان بن گیا ہے۔

بعض جاپانیوں سے بات کرنے کے بعد ایک بالکل نئی چیز میرے علم میں آئی۔ وہ تعلیم کے سال (education years) کا لفظ تھا۔ معلوم ہوا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان میں تعمیر شعور کی ایک مستقل تحریک چل پڑی اور اس نے قومی تحریک (national movement) کی صورت اختیار کر لی۔ اس تحریک کا مقصد تصور (outlook) کو بدلنا تھا۔

تعلیم کے سال (ایجوکیشن ایرس) کا مرحلہ fifties & sixties (خمسینات اور ستینات) کے دوران تقریباً ۱۵ سال تک جاری رہا۔

قوم کے اندر تعمیری شعور پیدا کرنے کے بعد دوبارہ تقریباً ۱۵ سال تک حصول معیار (pursuit of quality) کا دور گزرا ہے۔ یہ دوسرا دور ستینات اور سبعینات (sixties & seventies) کے زمانہ میں جاری رہا۔ اس طرح تیس سالہ فکری جدوجہد کا نتیجہ وہ عملی ترقی ہے جو آج جاپان کو حاصل ہوئی ہے۔

جاپان نے تعمیر شعور کے محاذ پر ۳۰ سال صرف کئے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم

رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے افراد قوم کی شعوری تعمیر پر ۳۰ دن بھی صرف نہیں کئے۔ حتی کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ تعمیر شعور بھی کوئی کرنے کا کام ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ اور ان کی پوری قوم پوری زمین تو کیا پوری کائنات کی صدر نشین بن جائے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، دوسری عالمی جنگ تک جاپانی مصنوعات کو غیر معیاری (substandard) سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج معاملہ الٹا ہے۔ آج میڈ ان جاپان کا مطلب ہوتا ہے سب سے اچھا اور سب سے زیادہ قابل اعتماد سامان۔ چنانچہ آج تمام لوگوں کی زبان پر یہ سوال ہے کہ جاپانی کیسے ایسا کرتے ہیں اور اتنا عمدہ کرتے ہیں:

How they do it and do it so well.

دنیا کے مختلف ملکوں سے خاص اس مقصد کے لئے لوگ جاپان آتے ہیں تاکہ اس راز کا پتہ لگائیں۔ اس قسم کے ایک صاحب، جو یورپ کے ایک ملک سے آئے تھے، ان سے ٹوکیو ایئرپورٹ پر میری ملاقات ہوئی۔ گفتگو شروع ہوئی تو میں نے کہا کہ جس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے آپ جاپان آئے، میں خود بھی اسی سوال سے دوچار ہوں۔ اس لئے آپ مجھے اپنی دریافت سے آگاہ کریں۔

انھوں نے کہا کہ اس کا راز میرے خیال میں یہ ہے کہ جاپانی لوگ بہت زیادہ معیار پسند (highly quality consious) ہوتے ہیں۔ ہر جاپانی کے اندر زبردست طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جو کام بھی کرے بہتر طور پر کرے۔ یہ خواہش اتنی گہری ہے کہ اس کی خاطر وہ ہر دوسری چیز حتی کہ خاندانی زندگی کو چھوڑ دیتا ہے:

Every Japanese possesses very strong desire to do well, whatever bit he does. This desire is so intense that he forfeits even family life in pursuit of perfecting it.

جاپان کے افراد کا یہ مزاج جاپان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہندستان جیسے ملکوں میں بدقسمتی سے یہ مزاج نہیں۔ یہی ہماری سب سے بڑی کمی ہے جس نے ہمیں عالمی سطح پر پیچھے کر رکھا ہے۔

یہاں مجھے ایک جاپانی آفس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک تصویر

خصوصی اہتمام کے ساتھ دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہوا تھا : ایڈورڈس ڈیمنگ (Edwards Deming) میں نے کہا کہ یہ تو ایک امریکی ہے، آپ کی حریف قوم کا ایک فرد۔ پھر آپ نے اس کی تصویر اپنے یہاں کیوں لگا رکھی ہے۔ دفتر کے ذمہ دار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ وہ تو ہمارے سب سے بڑے گرو ہیں :

He is our super-guru.

ایڈورڈس ڈیمنگ ایک ماہر شماریات - (statistician) کا نام ہے۔ اس نے صنعت کی ترقی کے لئے کوالیٹی کنٹرول کا نظریہ پیش کیا اور اس کے اصول وضع کئے۔ جاپانیوں نے فوراً اس کو لے لیا اور اس کو اپنی ترقی کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ اس معاملہ میں انھوں نے اپنی قوم کو اتنا باشعور بنایا کہ پوری قوم کے لئے کوالیٹی کی حیثیت ایک طریق زندگی (way of life) کی ہوگئی۔ حتی کہ انھوں نے اپنی صنعتی پیداوار کو زیرو ڈیفکٹ (zero defect) کے مرحلہ میں پہنچا دیا۔

جاپانیوں کو امریکہ سے سخت چوٹ پہنچی تھی، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ امریکیوں کو دشمن بتا کر ان کے خلاف الفاظ کا طوفان جاری کر دیں۔ اس کے بجائے انھوں نے امریکیوں سے سیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دشمن کے اندر سے بھی اپنے موافق باتیں نکال لیں۔ یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے، اور ایسے ہی لوگ اس دنیا میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

جاپان میں قیام کے لئے میرے پاس دو ہفتہ کا ویزا تھا۔ مگر بعض اسباب کی بنا پر میں دو دن ہی یہاں ٹھہر سکا۔ ٹوکیو میں ایک اسلامک سنٹر ہے۔ یہ ۱۹۶۵ میں قائم ہوا۔ ۱۹۸۲ میں اس کی مستقل عمارت بنائی گئی۔ اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبد الرحمٰن صدیقی کا ٹیلیفون امریکہ میں آیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامک سنٹر میں میرا پروگرام رکھیں۔ اس سے پہلے دہلی میں ڈاکٹر اسکندر احمد چودھری (مقیم ٹوکیو) کا خط ملا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کی آمد کے موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ جاپانی مسلمانوں کا ایک اجتماع ٹوکیو کے اسلامک سنٹر میں رکھیں۔

میرے مختصر قیام کی وجہ سے اس قسم کا کوئی پروگرام تو نہیں بنا، البتہ اپنے مختصر قیام کو میں نے زیادہ سے زیادہ اس مقصد کے لئے استعمال کیا کہ میں جاپان کو سمجھوں۔ ایک بار بس میں میری

ملاقات ایک جاپانی سے ہوئی۔ وہ انگریزی جانتا تھا، بات چیت کے دوران اس نے اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکالا۔ اس پر لکھا ہوا تھا ـــــ جاپان اٹھ، دنیا کو تیری ضرورت ہے:

Stand up, Japan, the world needs you.

اس سے گفتگو کر کے اندازہ ہوا کہ جاپانیوں میں ایک نیا گروہ ابھر رہا ہے۔ وہ موجودہ صورت حال پر مطمئن نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف عمدہ سامان تیار کر کے دنیا میں بیچنا یا قوموں کو مالی مدد دینا کافی نہیں۔ دنیا میں امن کا دور لانے کے لئے ہمیں کچھ اور کرنا چاہئے۔ تاہم جاپانیوں کی اکثریت زیادہ تر اقتصادی انداز میں سوچتی ہے:

the Japanese have grown used to thinking of decisions only in terms of economics.

اس نے کہا کہ جاپانیوں میں نیا ذہن بنانے کے لئے نصف صدی کی مدت درکار ہوگی تاکہ ان میں یہ سوچ ختم ہو کہ محض دعا کرنے سے امن آسکتا ہے:

It could take half a century to re-educate the Japanese so that they stop thinking that merely praying for peace will bring peace.

جاپان کو اپنے مزید حوصلوں کی تکمیل کے لئے ایک "آئیڈیالوجی" کی ضرورت ہے۔ مگر جاپان کے پاس کوئی مکمل آئیڈیالوجی نہیں۔ یہی جدید جاپان کی سب سے بڑی کمی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی ضرورت بھی۔

جلد ہی ۲۲ نومبر ۱۹۹۰ کو جاپان کے بادشاہ اکی ہیتو (Akihito) کی تخت نشینی کی رسم ٹوکیو میں ادا کی گئی ہے۔ وہ ۱۹۳۳ میں پیدا ہوئے اور وہ جاپان کے ۱۲۵ ویں شہنشاہ ہیں۔ ہیرو ہیتو کے انتقال (۷ جنوری ۱۹۸۹) کے بعد انھیں یہ عہدہ ملا تھا۔ تاہم محل کے آداب کے مطابق ان کی باقاعدہ تخت نشینی پچھلے ہفتہ کو انجام پائی ہے۔ میں نے ایک جاپانی سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں کے عقیدہ کے مطابق، جاپانی شہنشاہ آسمان کا خدائی بیٹا ہے:

Is the Japanese Emperor the divine Son of Heaven?

اس نے کہا کہ پہلے جاپانی ایسا سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ایسا خیال نہیں کرتے۔ اس نے بتایا کہ دوسری

عالمی جنگ سے پہلے جاپانیوں کا عام خیال یہ تھا کہ شہنشاہ زندہ خدا (living god) ہے۔ اور وہ ان کا محافظ ہے۔ مگر دوسری عالمی جنگ میں جب جاپان کو شکست ہوئی تو ان کا یہ عقیدہ متزلزل ہوگیا۔ مزید یہ کہ خود شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہوں۔ جاپانی اگرچہ اب بھی اپنے بادشاہ کو کامی (Kami) کہتے ہیں جس کے معنی خدا کے ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ لفظ صرف علامتی معنی میں بولا جاتا ہے نہ کہ حقیقی معنی میں۔

میں نے کہا کہ پہلے آپ لوگ اپنا حقیقی خدا کہتے تھے، اب آپ لوگوں کے پاس صرف علامتی خدا ہے۔ اس کے جواب میں وہ مسکرا کر رہ گیا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

۶ اگست ۱۹۸۹ کو دہلی میں میری ملاقات ایک جاپانی صحافی کونیو نیشی (Kunio Nishi) سے ہوئی تھی۔ وہ ٹوکیو کے روزنامہ سیکائی نپو (Sekai Nippo) کے رپورٹر کے طور پر دہلی آئے تھے اور مجھ سے ملے تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے جاپانی شہنشاہ اور خدا کے عقیدہ کی بابت سوال کیا۔ انھوں نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ تھا:

The Emperor was "God" and respected by Japanese people before world war II. He was the supreme head in the old Japanese constitution. In the name of the Emperor the war against America and Britain was fought. But after the defeat in the war, Japanese people have been changed into behaving that the Emperor is simply a man. The New Constitution puts him as the symbolic head of Japan. Now the Emperor has no political power.

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷ میں جاپان کی تاریخ کا ایک صفحہ نقل کیا گیا تھا۔ یہ بے حد عبرت ناک ہے۔ ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت جاپان میں شہنشاہ میجی (Meiji) کی حکومت تھی۔ برطانی استعمار کے زیر اثر جاپان میں مسیحیت پھیلنے لگی۔ مقامی مذہب میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ میجی نے مسیحیت کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے چاہا کہ وہاں مسلمانوں کو بلائے۔ اس نے ترکی کے سلطان عبد الحمید ثانی کو خط لکھا کہ آپ کچھ مسلم علماء کو جاپان بھیجیں تاکہ وہ مسیحی مبلغین سے مناظرہ کریں اور یہاں کے لوگوں کے سامنے اپنا مذہب پیش کریں۔

سلطان عبد الحمید ثانی نے ترکی کے علماء (بشمول سید جمال الدین افغانی) کو دربار میں بلایا اور مشورہ کیا۔ مگر کسی بھی عالم نے اس پیش کش کو اہمیت نہ دی۔ وہ غیر ضروری بحثیں کرتے رہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی ایک عالم یا مبلغ بھی جاپان بھیجا نہ جاسکا۔

اس واقعہ پر اب ایک سو سال گزر چکے ہیں۔ اگر اس وقت کے علما نے جاپان کے بادشاہ کی اس پیش کش کو فوراً قبول کرلیا ہوتا اور جاپان کے لئے اسلامی مبلغ بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا تو ایک سو سال پورا ہونے کے بعد اب جاپان میں اسلام کا کیا حال ہوتا، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

معروف افراد کی سطح پر تو یہ کام نہ ہوسکا۔ تاہم غیر معروف افراد کے ذریعہ جاپان میں تبلیغی کام کچھ نہ کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس کی ایک مثال الرحلة اليابانية ہے۔ یہ ایک مصری مسلمان علی احمد الجرجاوی کی کتاب ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ (۱۳۲۵ھ) میں جاپان کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد یہ کتاب لکھی جو اسی زمانہ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ قاہرہ کے المكتبة الازهرية میں موجود ہے۔ قطر کے عربی ماہنامہ الامۃ کے شمارہ شوال ۱۴۰۶ھ (جون ۱۹۸۶) میں اس پر چار صفحہ کا تعارف چھپا ہے۔

علی احمد الجرجاوی نے اخبار میں پڑھا کہ جاپان کے بادشاہ میکادو کے حکم سے جاپان میں ایک مذہبی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس میں ہر مذہب کے نمائندے شریک ہوں گے۔ انھوں نے اپنے جریدہ الارشاد میں لکھا کہ مصر سے مسلمانوں کا ایک وفد جاپان کی اس کانفرنس میں شرکت کرے۔ مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوسکی۔ آخر کار وہ کلکتہ کی جامع مسجد کے امام احمد موسی المصری اور تیونس کے ایک شخص کو لے کر ٹوکیو کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بحری سفر کا زمانہ تھا۔ وہ اسکندریہ، تونس، مراکش، اٹلی، جدہ، عدن، بمبئی، کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ، یوکاہاما ہوتے ہوئے ٹوکیو پہنچے۔ مصر سے جاپان تک ۱۲ ہزار میل سے زیادہ کا سفر کیا۔

ٹوکیو میں معلوم ہوا کہ ہندستان سے سید حسین عبد المنعم بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ ان چار آدمیوں نے ٹوکیو میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ مالک مکان کا نام موسیو جازنیف تھا۔ سید حسین عبد المنعم انگریزی سے واقف تھے۔ وہی مترجم کا کام کرتے تھے۔ مالک مکان نے ان لوگوں سے اسلام کی تعلیمات کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے اس کے سامنے اسلام کا تعارف کرایا۔ جاپانی نے اسی مجلس میں اسلام قبول کرلیا اور کہا کہ آج سے مجھے مسلمانوں میں سے سمجھو (اعتبروني من الآن في عداد المسلمين)

موسیو جازنیف نے اسلام کی تبلیغ کے معاملہ میں ان لوگوں کی ہر طرح مدد کی۔ یہاں تک کہ چند مہینے کی کوشش سے تقریباً ۱۲ ہزار جاپانی مسلمان ہوگئے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ جاپانیوں میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے

میں جو چیز معاون ہوئی وہ یہ کہ جاپانی ایسے لوگ ہیں جن کے اندر فطری طور پر یہ استعداد ہے کہ وہ ہر اس چیز کو قبول کر لیں جو عقل کے موافق ہو (لانھم قوم عندھم استعداد طبیعی لقبول کل مایوافق العقل) صفحہ ۵۳

مسلم رہنما ہر جگہ صلیبیت اور صہیونیت اور عرب قومیت کو عالم اسلام کا سب سے بڑا خطرہ بتا رہے ہیں۔ مگر وہ تبلیغی اسلام کی تسخیری طاقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ "سب سے بڑا خطرہ" کا انکشاف کرنے والے بہت ہیں مگر "سب سے بڑا امکان" کا اعلان کرنے والا کوئی نہیں۔

سوویت روس کی مشرقی سرحد پر جزیروں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان جزیروں کو کوریل جزیرے (Kuril Island) کہا جاتا ہے۔ یہ جزیرے پہلے جاپان کا حصہ تھے۔ یہ جزیرے ایک ہزار کیلو میٹر سے زیادہ رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر غیر آباد ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے آخر میں یالٹا کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق، سوویت روس نے کچھ جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۵ کا ہے۔

روس اور جاپان کے درمیان یہ ایک مستقل نزاع کا باعث تھا۔ جاپان کی بار بار کوشش کے باوجود روس ان جزیروں کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ مگر جاپان کی غیر معمولی ٹکنکل ترقی کے بعد یہ خود روس کی ایک ضرورت بن گئی۔ کیوں کہ سوویت روس جاپان کی ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر جاپان کا کہنا تھا کہ پہلے ہمارے جزیروں کو ہمارے حوالے کرو، اس کے بعد ہمارے اور تمہارے درمیان ٹکنکل تعاون کا آغاز ہو سکتا ہے۔

موجودہ نزاع عملاً چار جزیروں پر ہے۔ تازہ خبر یہ ہے کہ سوویت یونین اس پر راضی ہو گیا ہے کہ وہ اس میں سے دو خاص جزیروں کو جاپان کے حوالے کر دے۔ جاپان کی حکمراں پارٹی کے لیڈر شنتارو آبے (Shintaro Abe) نے سوویت یونین کے پروپوزل کو بہت اہم (very important) قرار دیا۔ میں نے اس خبر کو پڑھا تو میری زبان سے نکلا ——— جاپان نے جنگ کے ذریعہ کھویا تھا، اور امن کے ذریعہ دوبارہ حاصل کر لیا۔

جزائر کوریل کی واپسی کا مسئلہ جب تک صرف جاپان کا مسئلہ تھا، روس اس کی واپسی سے انکار کرتا رہا۔ مگر جب ان جزائر کی واپسی سے خود روس کا انٹرسٹ وابستہ ہو گیا تو اس نے اپنی سابقہ پالیسی بدل دی ——— اگر آپ حریف کی ضرورت بن جائیں تو آپ کسی لڑائی

کے بغیر اپنے حریف کو جھکانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

۲۲ جون ۱۹۹۰ کو سان فرانسسکو میں جاپان کے وزیر خارجہ اور امریکہ کے وزیر خارجہ کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں جاپانی وزیر نے امریکہ کے ایک مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا جس کو اخبارات نے ایک بہت بڑا نہیں (very big no) سے تعبیر کیا ہے۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ جاپان اگلے دس برسوں (۲۰۰۰ - ۱۹۹۱) کے درمیان اپنی آمدنی کا دسواں حصہ (چار ٹریلین ڈالر) عوامی سہولت (public amenities) اور سماجی کاموں (social infrastructure) پر خرچ کرے۔ یعنی پارک، سڑکوں اور سیوریج لائن وغیرہ کا نظام بہتر بنانے پر۔

جاپان کے لوگ دنیا کے بہترین لوگ ہیں۔ نیز جاپان ایک انتہائی دولت مند ملک ہے۔ مگر جاپان کا سیاح حیرت انگیز طور پر دیکھتا ہے کہ جاپان میں تمدنی سہولتیں اس اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں جو امریکہ یا مغربی جرمنی جیسے ملک میں نظر آتی ہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ جاپان ان مدوں میں اپنی جمع شدہ دولت کا ایک معقول حصہ خرچ کرے۔ مگر جاپان ابھی تک اس کے لئے تیار نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں جاپان اس قدیم تجارتی اصول پر قائم ہے ـــــ گھر بناؤ کپا، کاروبار کرو لپکا۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے، لندن کے ایک اخبار دی انڈیپنڈنٹ (The Independent) میں حال میں ایک خط چھپا ہے۔ مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ جنت وہ ہے جہاں آدمی کو انگلش مکان، چینی باورچی، امریکی تنخواہ اور جاپانی بیوی حاصل ہو۔ اس کے برعکس جہنم وہ ہے جہاں کسی کو جاپانی مکان، انگلش باورچی، چینی تنخواہ اور امریکی بیوی دے دی جائے:

Heaven consists of an English house, a Chinese cook, an American salary and a Japanese wife. On the other hand, a Chinese salary and an American wife.

جاپان کے ایک ممتاز لیڈر شنتارو اشی ہارا (Shintaro Ashihara) کا ایک آرٹیکل

لاس اینجلیز ٹائمس (Los Angeles Times Syndicate) میں چھپا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ امریکہ اور جاپان کے درمیان ۱۹۶۰ میں جس سیکورٹی ٹریٹی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے، وہ اب مکمل طور پر فرسودہ (obsolete) ہو چکا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت جاپان نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ وہ جاپان میں مقیم امریکی فوجوں کا ۴۰ فیصد خرچ ادا کرے گا۔ مگر اب بدلے ہوئے حالات میں ہم کو اپنے دفاع کے لئے امریکی فوجوں کی ضرورت ہے اور نہ اس کا خرچ ادا کرنے کی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ جاپان اپنے مائیکرو چپ کارڈ کو استعمال کرنے پر غور کرے تاکہ امریکہ کو ہوش میں لایا جاسکے:

It is time for Japan to consider the possibility of playing our microchip card in order to bring the US to its senses.

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ہندستان میں اور جاپان میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ ہندستان میں ہمارے لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ کمیونل کارڈ (ہندو کارڈ، مسلم کارڈ) کھیلتے ہیں۔ مگر جاپان کا لیڈر اپنے سیاسی مقصد کے لئے بھی یہ سوچ رہا ہے کہ اس کو مائیکرو چپ کارڈ کھیلنا چاہئے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہندستان میں تخریبی سیاست چلائی جاتی ہے اور جاپان میں تعمیری سیاست۔

جدید صنعتی انقلاب نے تمام پرانے معانی کو بالکل بدل دیا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۹۰ میں شری لال کرشن ایڈوانی نے سومناتھ سے ایودھیا تک ۱۰ ہزار میل کی جو رتھ یاترا کی، اس رتھ کا نام "رام رتھ" رکھا گیا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ "جاپان رتھ" تھا۔ کیوں کہ وہ رام کی قدیم بیل گاڑی کی نقل نہ تھا۔ یہ دراصل ایک ایئر کنڈیشنڈ جاپانی وین تھی جس کو اوپر سے رتھ کی صورت دیدی گئی تھی۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید نے فضا میں بادل کے ٹکڑے کو چلتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ جہاں چاہے جاکر برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا (أمطری حیث شئت فسیاتینی خراجك)۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اگر دنیا والوں سے کہیں کہ تم خواہ جو بھی سرگرمی دکھاؤ، اس کا مالی فائدہ ہم کو ہی ملے گا تو غلط نہ ہوگا۔

پرانا لطیفہ ہے "عقل بڑی کہ بھینس" مگر موجودہ زمانہ میں جاپان نے اس میں ایک اور اضافہ کیا ہے۔ اس نے عملی طور پر ثابت کیا ہے "علم بڑا نہ کہ ہتھیار"۔ اس نے اس کو ایک ٹھوس حقیقت بنا کر دکھا دیا ہے۔ ایک امریکی مبصر کے الفاظ میں جاپان نے ثابت کیا ہے کہ آتشیں طاقت (firepower) کے مقابلہ میں دماغی طاقت (brainpower) زیادہ بڑی اور زیادہ موثر ہے۔

جاپان نے یہ برتر طاقت علم کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ جاپان نے اپنی علمی ترقی کے ذریعہ ٹکنالوجی میں نئی بلندیاں حاصل کیں۔ مثال کے طور پر سب سے اعلیٰ سیمی کنڈکٹر جاپان میں تیار ہوتا ہے جو کہ کمپیوٹر کی صحت کارکردگی کی ضمانت ہے۔ جاپان کی دو اعلیٰ شخصیتوں کی تیار کی ہوئی ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام معنی خیز طور پر یہ ہے ـــــ جاپان جو کہہ سکتا ہے کہ نہیں (The Japan that Can Say No) اس کے مصنفین نے جاپان کو مشورہ دیا ہے کہ امریکہ اگر جاپان سے اپنے مطالبات بند نہیں کرتا تو جاپان کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ وہ اپنے سیمی کنڈکٹر کی جانکاری (expertise) سوویت روس کو دیدے گا۔ اس پر کچھ امریکی مبصرین نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت امریکہ کے لئے "پرل ہاربر" کے برابر ہے۔

جاپان نے اپنی موجودہ صنعتی اور اقتصادی ترقی علم کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ ایک امریکی کتاب میں بتایا گیا ہے کہ بین اقوامی سطح پر امریکی طلبہ بیس صنعتی قوموں میں دسویں نمبر ہیں۔

جاپانیوں کی اسی بڑھی ہوئی معیار پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی مصنوعات کو بے نقص (zero defect) کے معیار تک پہنچا دیا۔ جاپانیوں کے اس مزاج کے متعلق میں نے ایک آرٹیکل پڑھا اس میں لکھا تھا کہ زیرو ڈیفکٹ کے معاملہ میں ان کا شوق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ معمولی جاپانی کارکن بھی اپنی کارکردگی کا تقابل جرمنوں اور امریکنوں سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر دوسرے لوگ پرزوں کو فی ملین کی سطح سے جانچتے ہیں تو جاپانی یہ چاہتا ہے کہ اس کو فی بلین کی سطح سے جانچے:

So relentless are they in their zeal for 'zero defect', that even the ordinary Japanese workers are said to compare their performance with that of the Germans and Americans: If, for instance, others control parts at the per-million level, the Japanese want to do it at the per-billion level.

جاپانی رہنماؤں نے اپنے افراد کے اندر معیاری پسند کا ذہن پیدا کیا۔ اس کے برعکس موجودہ مسلم رہنما اپنی قوم کے افراد میں شکایت پسندی کا ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ جاپانیوں کی سوچ یہ ہے کہ دوسرے لوگ اگر اچھا کام کرکے آگے بڑھے ہیں تو ہم اور زیادہ اچھا کام کرکے ان سے آگے نکل جائیں۔ جب کہ نام نہاد رہنماؤں نے موجودہ مسلمانوں کے اندر جو ذہن پیدا کیا ہے وہ یہ کہ دوسرے لوگ جس چیز کو لیاقت کی بنیاد پر حاصل کر رہے ہیں۔ اس کو تم مطالبہ کی بنیاد پر حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور جب مطالبہ اور ڈیمانڈ کی بنیاد پر وہ چیز تم کو نہ ملے تو اس کو تعصب کا نتیجہ بتا کر شکایت اور احتجاج کا لفظی طوفان جاری کر دو۔

ٹوکیو میں ۱۹۰۸ میں اسکول آف فارن لینگویجز قائم ہوا۔ اس میں اردو زبان کا بھی ایک شعبہ تھا۔ اس کے تحت غالباً پہلی بار پانچ جاپانی طالب علموں نے اردو پڑھنا شروع کیا۔ ۱۹۱۱ میں اس شعبہ کو ترقی دی گئی تو طلبہ کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ۱۹۰۹ میں مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی اس شعبہ کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ مولانا محمود حسن صاحب کی تحریک آزادی کے پروگرام کے تحت انگلینڈ اور امریکہ ہوتے ہوئے جاپان پہنچے تھے۔ اور یہاں ٹوکیو کے مذکورہ اسکول میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کئی زبانیں جانتے تھے۔ وہ نہایت متحرک آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ قیام میں ٹوکیو میں اسلامک فریٹرنٹی (Islamic Fratenity) کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اسی نام سے ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا۔ یہ اخبار جلد ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا پرچہ الاسلام (Al-Islam) کے نام سے نکالا۔ ان پرچوں کا نام اگرچہ اسلامی تھا مگر عملاً یہ دونوں پرچے سیاسی پرچے تھے۔ حکومت جاپان کو مولانا برکت اللہ بھوپالی کی سیاسی سرگرمیاں پسند نہیں آئیں۔ ۱۹۱۴ میں ان کو اسکول کی ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ جاپان سے واپس چلے گئے۔

۸۰ سال پہلے مولانا برکت اللہ بھوپالی کو جاپان میں کام کے جو مواقع ملے تھے اس کو اگر وہ اشاعت اسلام کے لئے استعمال کرتے تو آج شاید جاپان کی تاریخ دوسری تاریخ ہوتی۔ موجودہ زمانہ میں زبان، جغرافیہ، تاریخ، کلچر وغیرہ موضوعات کے تحت ساری دنیا میں

مختلف ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ ان اداروں کے تحت مسلمانوں کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ اس سے وابستہ ہوکر دنیا کے ہر ملک میں قیام کرسکیں۔ اس جدید امکان کے تحت بیسویں صدی میں لاکھوں مسلمانوں کو ساری دنیا میں رہنے اور کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اگر مسلمانوں میں دعوتی ذہن ہوتا تو یہ مواقع موجودہ زمانہ میں اسلام کی عالمی اشاعت کا ذریعہ بن جاتے۔ مگر دعوتی ذہن نہ ہونے کی بنا پر یہ مواقع اشاعت اسلام کے حق میں استعمال نہ ہوسکے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا اسلامی نقصان ہے جو موجودہ زمانہ میں ہمیں پیش آیا ہے۔

ٹوکیو کے مذکورہ لسانی اسکول کے ایک اردو ٹیچر مسٹر بدر الاسلام فضلی تھے۔ وہ دسمبر ۱۹۳۰ میں جاپان پہنچے اور ڈیڑھ سال تک وہاں رہے۔ ہندستان واپس آکر انھوں نے "حقیقت جاپان" کے نام سے اپنا مفصل سفر نامہ لکھا تھا جو انجمن ترقی اردو دہلی سے ۱۹۳۴ میں شائع ہوا۔ اس جاپانی سفر نامہ کا ایک جزء الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ میں شائع کیا جاچکا ہے۔

آج جاپان کی کئی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ اردو۔ جاپانی لغت بھی شائع کیا جا چکا ہے۔ اردو سے متعلق اور بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ اسکی تفصیل ہفت روزہ ہماری زبان (نئی دہلی) کے شمارہ ۸ جنوری ۱۹۹۱ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

شومی اوکاوا (Shumi Okawa) غالباً پہلے جاپانی عالم ہیں جنھوں نے براہ راست عربی سے قرآن کا ترجمہ جاپانی زبان میں کیا۔ جاپان کی کئی یونیورسٹیوں میں اردو، عربی اور اسلامیات کی تعلیم کے شعبے ہیں۔ ان کی وجہ سے اسلام کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ تبلیغی جماعت کے لوگوں نے بھی جاپان میں اسلام کی اشاعت کا کام کیا ہے۔

۱۹۷۳ میں جب شاہ فیصل نے تیل کی سپلائی جزئی طور پر بند کی تو اچانک دنیا کو معلوم ہوا کہ جدید صنعتی دور میں تیل کو انتہائی اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کے نتیجہ میں عرب دنیا نے نئی اہمیت حاصل کرلی اور نتیجۃً مسلم کلچر اور اسلامی علوم کا مطالعہ شروع ہوگیا۔ اس سے پہلے جاپان کے اہل علم اسلام کے معاملہ میں یورپ اور امریکہ کی کتابوں پر انحصار کرتے تھے، اب ان کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ وہ براہ راست طور پر اسلام کا مطالعہ کرکے مسلم دنیا سے واقفیت حاصل کریں۔

۱۹۷۵ میں باقاعدہ طور پر جاپان کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کرنے کا کام شروع ہوا۔ ۱۹۸۵ میں ایک بہت بڑا شعبہ قائم ہوا جس کا انگریزی نام (The Institute of Middle Eastern Studies) ہے۔ اسی طرح ٹوکیو یونیورسٹی میں (Institute of Oriental Culture) قائم ہے۔ پچھلے برسوں میں جاپان میں اسلام کے موضوع پر کئی سیمنار ہو چکے ہیں۔ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ ایک سہ ماہی مجلہ چھاپتا ہے جس کا نام میدان (Maydan) ہے۔ اس میں جاپانی اور انگریزی زبان میں مضامین ہوتے ہیں۔

ایک اخبار میں جاپان میں آنے والے روبوٹ انقلاب (robot revolution) کا ذکر تھا۔ اس کا پہلا جملہ یہ تھا ـــــ آجکل جو لوگ جاپان آتے ہیں وہ اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ کس طرح جاپان میں ہر صنعتی شعبہ میں روبوٹ مشینیں کام کر رہی ہیں:

Recent visitors to Japan are awe-struck at the proliferation of robots in every field of industrial activity.

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ دنیا بھر میں جتنے روبوٹ استعمال ہوتے ہیں، اتنے جاپان میں تنہا استعمال ہو رہے ہیں۔ آگ بجھانا، گھر کی صفائی کرنا، سمندر کی تہوں میں سامان لے جانا، کارخانوں میں سخت محنت والے کام کرنا، سرنگوں میں داخل ہونا وغیرہ، وغیرہ

روبوٹ کی سائنس کو روبوٹکس (Robotics) کہا جاتا ہے۔ اب روبوٹکس کی تحقیق خلائی روبوٹ بنانے کی طرف متوجہ ہے۔ ایسے روبوٹ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو خلائی کارخانوں میں کام کر سکیں۔ مضمون میں مستقبل کے روبوٹ کے بارہ میں بہت سی انوکھی باتیں درج تھیں۔ میں نے ایک ہم سفر سے اس کا ذکر کیا۔ وہ انجینئر تھا۔ اس نے کہا کہ آج جب یہ باتیں کی جاتی ہیں تو وہ لوگوں کو سائنسی افسانہ معلوم ہوتی ہیں مگر اس صدی کے خاتمہ تک یہ سب عام بات ہو چکی ہوگی:

We seem to be talking the stuff of science fiction but by the turn of the century all this may sound commonplace.

میں نے سوچا کہ عین یہی بات آخرت کے معاملہ میں بھی ہے۔ آج جب لوگوں سے جنت اور

دوزخ کی بات کی جائے تو لوگوں کو اس کی صحت پر یقین نہیں آتا۔ حتی کہ آخرت کا اقرار کرنے والے بھی اس کو شعور کی سطح پر سمجھ نہیں پاتے۔ مگر موجودہ زندگی کے ختم ہوتے ہی جنت اور دوزخ ایسے واقعہ کی صورت میں سامنے آجائے گی کہ لوگ محسوس کریں گے کہ یہ تو اتنی بڑی حقیقت تھی کہ اس سے بڑی حقیقت اور کوئی نہیں۔

۹ دسمبر کو ظہر کی نماز کے بعد ہوٹل سے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں کے قاعدہ کے مطابق درمیان میں بس روکی گئی۔ جاپانی پولیس نے تمام مسافروں کو مع سامان اتار کر ان کے پاسپورٹ اور ان کے سامان کی جانچ کی۔ میری باری آئی تو مجھ کو دیکھتے ہی میز کی دوسری طرف کھڑے ہوئے آدمی نے کہا "آپ مسلمان ہیں" میں نے کہا، ہاں۔ اس کے بعد ابتداءً انگریزی اور اس کے بعد عربی میں گفتگو ہوئی۔ اس نے بتایا کہ میں تین سال تک خرطوم میں رہا ہوں اور "شویا" عربی جانتا ہوں۔ اس قافلہ میں میں اکیلا مسلمان تھا۔ اس نے سب کی باقاعدہ چیکنگ کی۔ مجھ کو صرف ایک مسکراہٹ کے ساتھ چھوڑ دیا۔

قیامت کے دن جو لوگ ایمان و اسلام کے ساتھ پہنچیں گے، وہ اسی طرح سرسری طور پر دیکھ کر آگے بڑھا دیے جائیں گے۔ مگر جن لوگوں کے پاس ایمان و اسلام کا سرمایہ نہ ہوگا، ان کا سخت حساب ہوگا اور حدیث میں آیا ہے کہ من نوقش فقد هلك۔ اللہ اس دن کی ہولناکی سے بچائے۔

جاپانی قوم اول و آخر ایک تجارتی قوم ہے۔ اس کا اخلاق بھی اس کے تجارتی مفاد کے تابع ہے۔ مثلاً اکثر ملکوں میں (خود دہلی میں بھی) ایئر پورٹ یا ایئر پورٹ ہوٹل سے مقامی ٹیلیفون مفت کیا جا سکتا ہے مگر جاپان میں اس کی سہولت نہیں۔ اکثر ملکوں میں ٹرانزٹ مسافر کے لئے ایئر پورٹ ٹیکس نہیں ہوتا مگر جاپان میں ٹرانزٹ مسافر سے بھی ۱۶ ڈالر ایئر پورٹ ٹیکس کے طور پر وصول کئے جاتے ہیں۔ وغیرہ

ہندستانی انسان بھی مفاد پسند ہے اور جاپانی انسان بھی مفاد پسند۔ تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔ ہندستانی انسان کے نزدیک مفاد پرستی کا مطلب اکسپلائٹیشن ہے۔ وہ ناقص سامان بیچ کر اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر جاپانی انسان کی مفاد پرستی اس کو یہ سکھاتی

ہے کہ بہتر سے بہتر سامان تیار کرو تاکہ ساری دنیا تمہارا سامان خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ ہندستانی انسان کا تجارتی مذہب دھوکا ہے، جاپانی انسان کا تجارتی مذہب اعلیٰ کوالیٹی۔ اس فرق کا مزید نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں اس قسم کے دنگے کبھی نہیں ہوتے جیسے کہ ہندستان میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ "کوالیٹی" کا مزاج آدمی کو امن پسند بناتا ہے اور "دھوکے" کا مزاج فساد پسند۔

لاس اینجلیز سے ٹوکیو تک کا سفر نہایت پرسکون گزرا تھا۔ کیوں کہ اس میں بیشتر جاپانی مسافر تھے۔ چند ہندستانی مسافر بھی تھے۔ ان کے مزاج کا سب سے پہلا مظاہرہ ایئر پورٹ پر گیٹ نمبر ۱ کے ویٹنگ ہال میں ہوا۔ یہاں ہندستانی لوگ آدھ گھنٹہ کے لئے جمع ہوئے تھے۔ وہ یہاں سے اٹھے تو میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ کوڑا پڑا ہوا تھا۔ جہاز کے اندر ایک ہندستانی مسافر نے کافی شراب پی لی۔ اس کے بعد وہ مدہوش ہو کر چلانے لگے۔ جہاز کا عملہ بڑی مشکل سے ان کو اٹھا کر پیچھے کی سیٹ پر لے گیا۔

میری سیٹ کے قریب ایک امریکی خاتون (Rebecca Becky Medcalf) تھیں۔ وہ سیاح کے طور پر ہندستان جا رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں خدا پر عقیدہ رکھتی ہوں، مگر کسی مذہب کو نہیں مانتی:

I believe in God, but not in any particular religion.

انھوں نے "مسلم ریلیجن" کا کوئی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ البتہ مختصر طور پر عیسائیت اور یہودیت کو پڑھا تھا، مگر وہ اس سے متاثر نہ ہو سکیں۔

اس قسم کے لوگ مغرب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ (اسلام کے علاوہ) مذاہب تحریف کی بنا پر انسانی عقل کو اپیل نہیں کرتے۔ مگر خدا کی معرفت انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ آدمی کسی خارجی مذہب کا انکار کر سکتا ہے مگر وہ خود اپنی فطرت کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جو مذہب کو نہیں مانتے، وہ عین اسی وقت گہرائی کے ساتھ خدا کے وجود کے معترف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو غیر محرف مذہب (اسلام) مل جائے تو وہ خدا کو بھی ماننے لگیں گے اور خدا کے بھیجے ہوئے سچے مذہب کو بھی۔

درمیان میں جہاز بینکاک میں اترا۔ یہاں کا وقت انڈیا کے مقابلہ میں ڈیڑھ گھنٹہ آگے

تھا۔ میں نے اپنی گھڑی تبدیل نہیں کی تھی۔ چنانچہ ملک ملک کے اعتبار سے میری گھڑی کا وقت بدلتا رہا۔ امریکہ میں ساڑھے دس گھنٹے کا فرق تھا، جاپان میں ساڑھے تین گھنٹہ کا، بینکاک میں ڈیڑھ گھنٹہ کا۔ کراچی میں یہ فرق آدھ گھنٹہ رہے گا اور دہلی پہنچ کر ملک کا وقت اور میری گھڑی کا وقت یکساں ہو جائے گا۔ یہی وہ آفاقی حقیقت ہے جو قرآن میں رب المشارق و المغارب کے لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

بینکاک ایئرپورٹ کی دیوار پر یہ لکھا ہوا نظر آیا کہ بینکاک کا مطلب ہے فرشتوں کا شہر:

Bangkok means – the city of angels.

قدیم زمانہ میں ہر قوم نے اسی طرح اپنے شہر، اپنی زبان، اپنے پہاڑ، اپنے دریا، اپنے درخت، غرض ہر نمایاں چیز کو خصوصی اہمیت کا حامل سمجھ کر ان کا ایک مقدس نام دے رکھا تھا۔ یہ قدیم مشرکانہ توہمات کا نتیجہ تھا۔ اس دور کو اسلام کے موحدانہ انقلاب نے ختم کیا۔ اب مشرکانہ توہمات اگر کہیں باقی ہیں تو تاریخی آثار کے طور پر باقی ہیں نہ کہ زندہ عقیدہ کے طور پر۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کی صبح کو دہلی واپس پہنچا۔ واپسی کے بعد مختلف لوگوں کے خط اور پیغام ملے۔ ان سے ان کے تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک تاثر نقل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحمید خاں صاحب اپنے خط مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۰ میں لکھتے ہیں:

It was indeed a pleasure and heart warming occasion for us to listen to you during your recent trip to the USA.

ڈاکٹر صاحب موصوف بلا معاوضہ خدمت کے طور پر ایک ادارہ چلا رہے ہیں۔ اس ادارہ کا مقصد امریکہ اور کناڈا میں مقیم مسلم خاندانوں کو مناسب رشتۂ نکاح کی تلاش میں مدد دینا ہے۔ ان کا خاص دائرۂ عمل وہ لوگ ہیں جو برصغیر ہند سے جا کر امریکہ اور کناڈا میں آباد ہو گئے۔ ضرورت مند لوگ حسب ذیل پتہ پر ربط قائم کر سکتے ہیں:

Dr. Abdul Hameed Khan, Islamic Marriage Bureau, P.O. Box 472, Atwood, California 92601, U.S.A.

خبرنامہ اسلامی مرکز ۸۰

۱ جنوری ۱۹۹۲ میں صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد اور محبوب نگر کا سفر کیا۔ ایک ہفتہ کے دوران مختلف قسم کے دعوتی اور تربیتی پروگرام ہوئے۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ روداد سفر کے تحت شائع کر دی جائیں گی۔

۲ غلام محمد شاہ صاحب گیارہ سال سے الرسالہ پڑھ رہے تھے۔ تاہم ابھی تک انھوں نے اس کی ایجنسی نہیں لی تھی۔ اب انھیں الرسالہ مشن کے مخالفین کا کچھ لٹریچر پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ لٹریچر انھیں بے معنی معلوم ہوا۔ مگر انھوں نے اس کی مخالفت میں پڑنے کے بجائے اپنے جوش کو مثبت رخ پر موڑ دیا۔ انھوں نے الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو پھیلانے کی مہم شروع کر دی۔ انھوں نے جنوری ۱۹۹۲ سے ایک سو الرسالہ اردو اور دس انگریزی سے اپنی ایجنسی شروع کی ہے۔ آئندہ مزید اضافہ کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

۳ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کی طرف سے ۲ فروری ۱۹۹۲ کو جے این یونیورسٹی سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تھا: قرآن اور اس کا اثر انسانی سماج پر۔ آرگنائزرس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر آدھ گھنٹہ خطاب کیا۔

۴ دسمبر ۱۹۹۱ میں چلڈرن پارک، نئی دہلی میں کتابوں کی نمائش لگائی گئی تھی۔ اس موقع پر الرسالہ مطبوعات کا بک اسٹال رکھا گیا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۹۲ میں پرگتی میدان، نئی دہلی میں بہت بڑی بک فیئر تھی۔ اس موقع پر بھی الرسالہ مطبوعات کا بک اسٹال لگایا گیا۔ دونوں بار کافی آدمیوں نے الرسالہ مشن سے تعارف حاصل کیا۔

۵ ڈوبرو گڈھ یونیورسٹی (آسام) کے ایک استاد نے "گڈ لائف" کا ترجمہ آسامی زبان میں کیا ہے۔ اور اب وہ اس کو کتابی صورت میں چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔

۶ جناب رفیق احمد صاحب (الٰہ آباد) نے اطلاع دی ہے کہ انھوں نے "سچا راستہ" نامی کتاب کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اب وہ اس کو شائع کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔

۷ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے

اردو، ہندی، انگریزی اور عربی میں ملک اور بیرونِ ملک
کی چھپی ہوئی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کا عظیم مرکز

• قرآن • حدیث • تفسیر • سیرت وسوانح • فقہ وقانون
• عقائد • دعوت وتبلیغ • تاریخ • اسلامی تحریک • اخلاقیات
• خواتین اور بچّوں کے لیے دینی اور اصلاحی کتابیں • ڈکشنریاں اور علمی مراجع
• پاکستان کی چھپی ہوئی علمی، ادبی اور دینی کتابیں • سیاست
• قاہرہ اور بیروت کی چھپی ہوئی عربی کتابیں • اسلامی معاشیات
• اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر معیاری کتابیں • ثقافت اور تعلیم
• اسلامی مجلّات ورسائل • دیگر ادیان ومذاہب کی بنیادی کتابیں
• زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ انسانیت سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ کتابیں
• اسلامی موضوعات پر آڈیو اور ویڈیو کیسٹ • طغرے اور عید کارڈ وغیرہ

الرسالہ بک سنٹر

نمبر ۱ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون: ۶۱۱۱۲۸، ۶۹۷۳۳۳

6/-	روشن مستقبل	20/-	انوار حکمت		
6/-	صوم رمضان		تعمیر کی طرف	175/-	…رآن جلد اول
	علم کلام	20/-	تبلیغی تحریک	175/-	…قرآن جلد دوم
	صداقت اسلام	20/-	تجدید دین	45/-	…بہ
	علما اور دور جدید	30/-	عقلیات اسلام	40/-	…لاب
	ہندستانی مسلمان	20/-	مذہب اور سائنس		…اور جدید چیلنج
	سیرت رسولؐ	8/-	قرآن کا مطلوب انسان	30/-	…قرآن
	عربی	5/-	دین کیا ہے	6/-	…اسلام
	الاسلام يتحدى	6/-	اسلام دین فطرت	6/-	…صحابہ
	سقوط الماركسية	6/-	تعمیر ملت	50/-	…ل
	حقيقة الحج	6/-	تاریخ کا سبق	40/-	…لام
	آڈیو کیسٹ	5/-	فسادات کا مسئلہ	40/-	…لام
25/-	A-1 حقیقت ایمان	5/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	25/-	…زندگی
25/-	A-2 حقیقت نماز	5/-	تعارف اسلام	20/-	…لام
25/-	A-3 حقیقت روزہ	5/-	اسلام پندرھویں صدی میں	60/-	…ت
25/-	A-4 حقیقت زکوٰۃ	6/-	راہیں بند نہیں	40/-	…تقیم
25/-	A-5 حقیقت حج	6/-	ایمانی طاقت	45/-	…اسلام
25/-	A-6 سنت رسولؐ	6/-	اتحاد ملت	40/-	…م اور اسلام
25/-	A-7 میدان عمل	6/-	سبق آموز واقعات	30/-	…در عصر حاضر
25/-	A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	8/-	زلزلۂ قیامت	40/-	…یہ
25/-	A-9 اسلامی دعوت	6/-	حقیقت کی تلاش	45/-	…ملت
	کے جدید امکانات	5/-	پیغمبر اسلام	30/-	…ج
25/-	A-10 اسلامی اخلاق	6/-	آخری سفر	25/-	…علیات
25/-	A-11 اتحاد ملت	6/-	اسلامی دعوت	25/-	…ور جدید کا خالق
25/-	A-12 تعمیر ملت	6/-	خدا اور انسان	35/-	…رسولؐ
25/-	A-13 نصیحت لقمان	10/-	حل یہاں ہے	80/-	…جلد اول
		5/-	سچا راستہ	80/-	…جلد دوم
		6/-	دینی تعلیم	80/-	…(ملکی اسفار)
	ویڈیو کیسٹ	6/-	حیات طیبہ	80/-	…(غیر ملکی اسفار)
	V-1 پیغمبر انقلاب	6/-	باغ جنت	35/-	…کا سفر
	V-2 اسلام دائمی امن	6/-	نار جہنم	20/-	…نامہ
	V-3 اسلام دور جدید کا خالق	10/-	خلیج ڈائری	25/-	…
	V-4 امت مسلمہ کے لیے نئے چیلنج	6/-	رہنمائے حیات	50/-	…لطی
	V-5 اسلام اور سماجی انصاف	6/-	شخصیات اسلام	20/-	…سیاسی تعبیر
	V-6 اسلام اور دور حاضر	3/-	تعدد ازدواج	20/-	…کمت

God Arises	75/-
Muhammad The Prophet of Revolution	75/-
Islam As It Is	
God Oriented Life	
Words of the Prophet	40/-
Introducing Islam	
Religion and Science	
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	20/-
Islam the Creator of Modern Age	50/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	6/-
Polygamy in Islam	3/-
Words of Wisdom	

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

1976-77 سال	90/-
1978	80/-
1979	80/-
1980	80/-
1981	80/-
1982	80/-
1983	80/-
1984	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91	85/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

THE ISLAMIC CENTRE C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013

Single Copy Rs. 5 □ Annual Subscription Rs 60/$25